الاحرار

پندرہ ۱۵ روزہ

لاہور

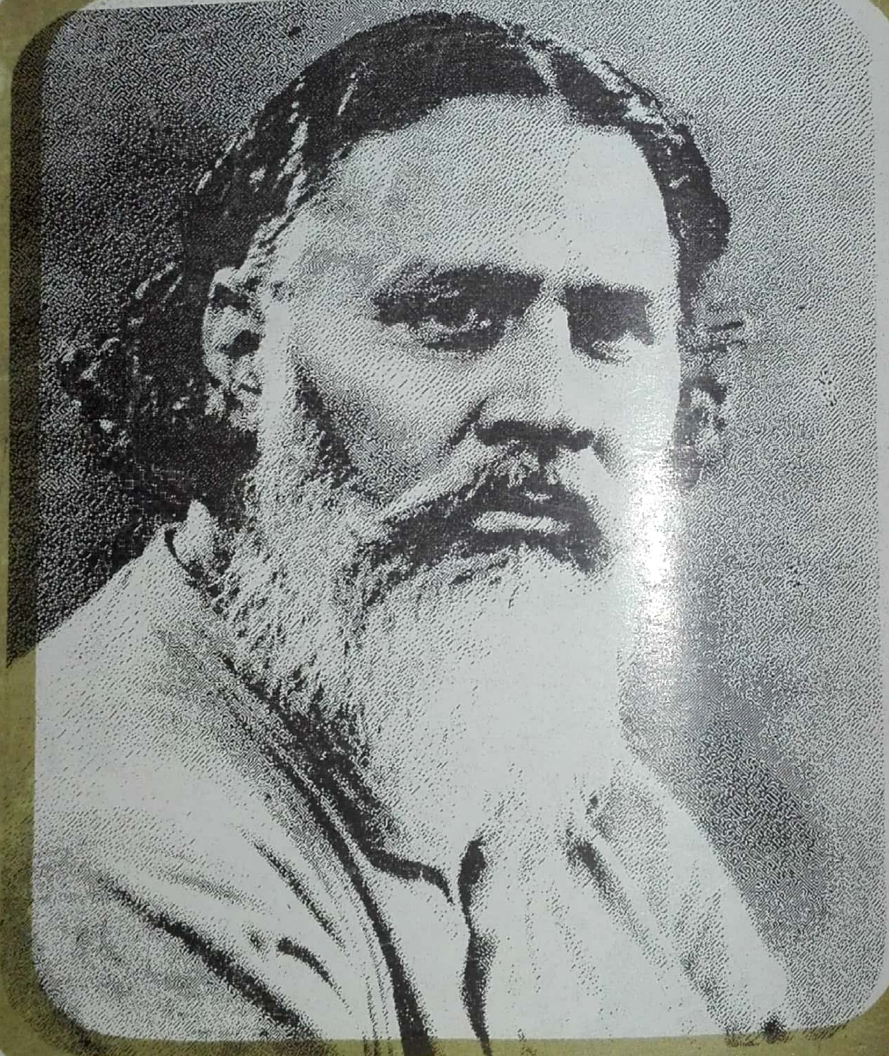
FORTNIGHTLY "AL- AHRAR" LAHORE

R.No.L-7...

۱۶ تا ۳۱ اگست ۱۹۹۴ء شمارہ ۱۰

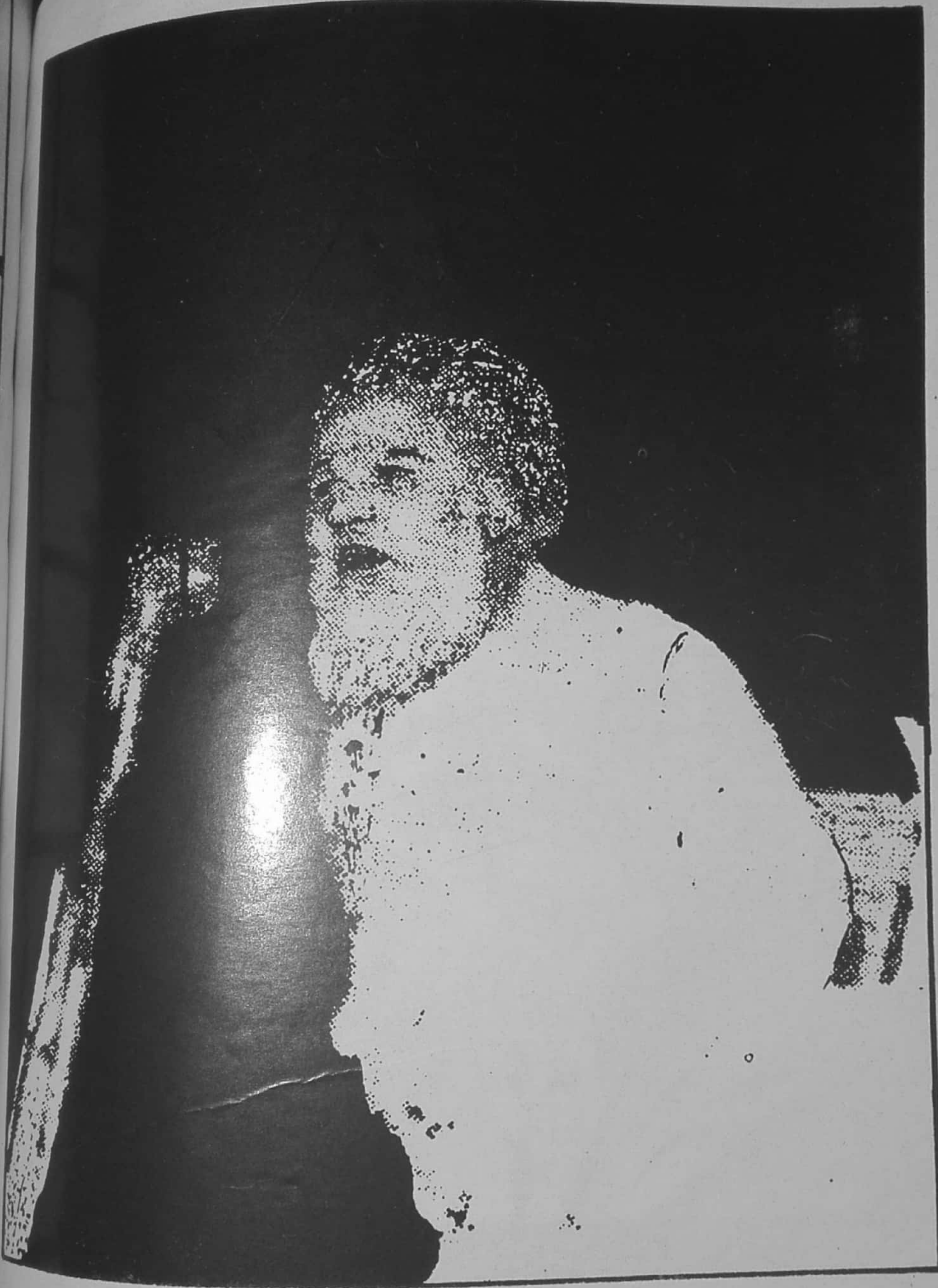
اشاعتِ خاص

بیادِ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ



مُدیرِ اعلیٰ

سیّد ابو مُعاوِیہ ابو ذر بُخاری



خطابت کا بادشاہ اپنی خطابت کے ایک انداز کے ساتھ

Scanned by CamScanner

پندرہ روزہ
الاحرار
لاہور
R.No. L-7818
FORTNIGHTLY "AL- AHRAR" LAHORE
جلد ۴ شمارہ ۱۰

۷ ربیع الاول تا ۲۱ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ - مطابق
۱۶ تا ۳۱ اگست ۱۹۹۴ء

قیمت: ——— 10 روپے
موجودہ شمارہ ۲۵ روپے
زرِ سالانہ: ——— 200 روپے

مجلسِ ادارت

مُدیرِ اعلیٰ: سید ابو معاویہ ابوذر بخاری
نائب مُدیر: سید محمد معاویہ بخاری
مُعاون: قاری محمد یوسف احرار

بدلِ اشتراک

بیرونی ممالک سے بذریعہ ہوائی ڈاک اور رجسٹری

سعودی عرب، مشرقِ وسطیٰ کے دیگر ممالک 125 ریال۔ متحدہ عرب امارات 125۔ درہم، بھارت و دیگر ایشیائی ممالک 130۔ امریکی ڈالر، بنگلہ دیش، اومان، ترکی، اردن 30 امریکی ڈالر، یورپ اور افریقہ 40 امریکی ڈالر، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 70 امریکی ڈالر، ویسٹ انڈیز، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ 30 امریکی ڈالر۔

عنوانِ مکاتبت و ترسیلِ زر

ناظمِ دفتر پندرہ روزہ "الاحرار" لاہور
قائم مقام دفتر: ۲۳۲ کوٹ تغلق شاہ ملتان (پاکستان) فون: 572044

اس شمارہ میں

مطبع: حمایتِ اسلام پریس ریلوے روڈ لاہور - ناشر: سید ابو معاویہ ابوذر بخاری - مقامِ اشاعت: دین محمد بلڈنگ بیرون دہلی دروازہ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ



پیغام ربانی

جہاد ناگوار ہونے کے باوجود فرض ہے

کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم وعسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم و عسیٰ أن تحبوا شیئاً وھو شر لکم۔ واللہ یعلم و انتم لا تعلمون۔ (البقرہ ۲۱۶)

ترجمہ: تم پر قتال فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔



ارشادِ نبوی

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ان الایمان لیارزالیٰ المدینتہ کما قارزالحیّۃُ الیٰ حجرھا (متفق علیہ)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ البتہ ایمان اسطرح مدینہ کی طرف سمٹ آئیگا جس طرح کہ سانپ سمٹتا ہے اپنے بل کی طرف۔

اداریہ

کچھ اشاعتہِ خاص کے بارہ میں

محترم قارئین! اس مرتبہ کی اشاعتِ خاص کیلئے کسی قسم کا کوئی اعلان اسلئے نہیں کیا گیا کیونکہ آخری مرحلہ طے ہونے تک اشاعتہ کا یقین ہی نہیں تھا۔ اور اگر اعلان کر دیا جاتا تو یقیناً آپ منتظر ہوتے۔ اور پھر کسی وجہ سے یہ اشاعتہ آپ تک نہ پہنچتی تو بے شمار سوالیہ خطوط موصول ہونے تھے۔ اور ہمیں معذرت نامے ایک ایک تک پہنچانے تھے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس اشاعتہ کو ممکن بنانے کیلئے یہ سب کچھ کرنا پڑا، یعنی بغیر کسی اطلاع کے طیاری۔ اور اب آپ کی خدمتہ میں اپنی تھوڑی سی محنت کو پیش کیا جارہا ہے۔

گر قبول افتدز ہے عزو شرف

ہمارے بہت سے قارئین ہیں جن سے ملاقات ہوتی رہتی ہے خطوط کے ذریعہ بھی اور بالمشافہ بھی۔ وہ ہمیشہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ حضرت شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ کے یوم وفات پر صرف انکے عقیدۃ مندوں کے مضامین ہی کیوں شائع ہوتے ہیں؟ آپ کی طرف سے کیوں نہیں؟

اسکے لئے جواباً عرض ہے کہ جہاں تک صرف اپنی ذات کا تعلق ہے اکثر حضرات ان تمام مجبوریوں سے آگاہ ہیں جو ان دنوں درپیش ہیں یعنی کثرۃ کار، ظاہر ہے کہ فرصت کے اوقات تبر کاً میسر آتے ہیں اتنا وقت نہیں ملتا کہ کچھ جمع و ترتیب کیا جاسکے۔ ایسے میں یہ کیونکر ممکن ہو کہ خاص اشاعتوں میں اپنا حصہ بھی شامل ہو۔

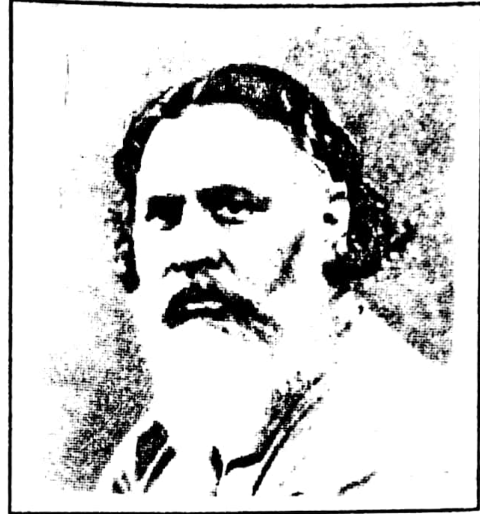
جب کہ اہل خاندان میں ذمہ دار حضرات کی جانب سے بہ وجوہ وہ سب کچھ نہیں ہوسکا جسکی توقع بلکہ جائز توقع عام وخاص کو تھی۔

اپنا حال تو اور بھی قابل رحم ہے کہ صرف سنی سنائی باتوں پر ہی ایمان ہے۔ نہ شاہ جی کو دیکھا نہ کوئی اور اُن جیسا کہ اس پر وہ کچھ کہہ سکیں جو ایک چشم دید معتبر گواہ کہہ سکتا ہے۔

جیسے کہ شاہ جی کے کچھ ہمسفروں میں سے چند ایک نے حسب توفیق ان کی صحبتوں سے جو کچھ اخذ کیا رقم کرنے کی کوشش کی ہے جن میں شورش کاشمیری مرحوم اور مرزا غلام نبی جانباز مرحوم کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص انکی خدمات انکی کسی کوتاہی کے سبب پس پشت ڈال کر یہ اعتراف نہ کرے کہ سب سے پہلے شاہ جی کی بھرپور شخصیت پر قلم انہی نے اٹھایا اور جیسا بھی لکھا بہرحال لکھا ہے۔ ورنہ آج تک بہت سے لوگ بے شمار صلاحیتوں کے باوجود صرف لفظی غل غپاڑہ کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکے۔ اور مذکورہ بالا مرحوم شخصیات کو برا بھلا کہنے کے باوجود وہ انہی کی جمع کردہ معلومات سے استفادہ کرنے پر بھی مجبور ہیں۔ کہ جتنا کچھ انہوں نے چھوڑا ہے اس سے زیادہ بہت کم لوگوں کے پاس تھا اور اب بھی صورت حال یہی ہے۔ اور اگر ہے تو سوء اتفاق سے وہ منظر عام پر نہیں لاسکے۔ شاہ جی جیسی بڑی شخصیات کے یوم وفات پر خصوصی اشاعتوں کا سلسلہ اب محض ایک روٹین کا حصہ ہے ورنہ جو آگ، جو لگن، جو عظیم مقصد شاہ جی کے پیش نظر تھا اور جس طرح اپنی بے پناہ شخصیت کے ہوتے ہوئے بھی شاہ جی نے ایک کارکن کی حیثیت میں کام کیا آج اس خوئے فقیرانہ کی بُو بھی باقی نہیں ہے البتہ ان اشاعتوں سے ایک حوصلہ ضرور ملتا ہے کہ ان کا تذکرہ کرکے شاید کوئی اچھا کام ہی کر رہے ہیں۔ چند صفحات پر مشتمل یہ کاوش کسی کی ہدایتہ یا متاثر ہونے کا ذریعہ بنے یا نہ بنے لیکن ایک عظیم انسان کے تذکرۂ خیر کا ذریعہ ضرور ہے۔ یہی وہ اطمینان ہے جو مجھ سے نالائق کے دل ودماغ کی تقویت کا باعث ہے اور آئندہ کیلئے زادِ راہ بھی۔



زندگی تھی یا کوئی طوفان



یہ نہیں کہ میں لکھ نہیں سکتا۔ ایسا نہیں ہے۔ اللہ نے فقیر کے گھر میں پیدا کیا مگر دل و دماغ شاہانہ بنا دیا، خدا کا فضل ہے زبان میں جانتا ہوں، برا بھلا خط اور بیان لکھتا بھی رہا۔ اگر میں اپنے متعلق ہی قلم اٹھا لیتا تو پھر کوئی چھوٹی موٹی کتاب نہ ہوتی بلکہ ایک بڑا دفتر تیار ہو جاتا، کیوں کہ میری زندگی ہی ایسی ہے کوئی زندگی تھی؟ ایک طوفان تھا۔ کوئی ایک بکھیڑا تو نہیں تھا سانس لینا مشکل تھا۔ انگریز جیسے دشمن سے ٹکر تھی، ہم تو خود موت کو دعوہ دیتے تھے۔ تقریر کی، جیل گئے، باہر آئے، پھر تقریر اور پھر جیل، اسی چکر میں ختم ہو گئے۔ جوانی آئی تو جیل میں گئے۔ واپس آئے تو بڑھاپا شروع ہو چکا تھا۔ ایسی زندگی میں بتاؤ بھلا پڑھنے لکھنے کا کام خاک ہوتا؟ چالیس برس تک اس ملک کے کونے کونے کی خاک چھانی۔ جو کچھ میں نے کیا اور جو کچھ دیکھا اب اس کا تصور بھی مشکل ہے، لیکن میں تو سپاہی بنکر ہر مورچے پر سب سے پہلے پہنچتا رہا۔ تھوڑا بہت مسجد اور مدرسہ میں پڑھا تھا۔ اس پر جیل میں جا کر عمل کیا، یہ تو فارغ اور گوشۂ عافیتہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا کام ہے کہ کتابیں لکھتے رہو اور چھاپتے رہو۔ اور اپنی نہ طبیعتہ نہ یہ پیشہ، ہم تو یہ جانتے تھے کہ جو پڑھا اور سمجھا ہے اس پر عمل کریں، ہمیں تو بال بچوں کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ اپنے وجود کا بھی کچھ ہوش نہیں تھا۔ سفر اور سفر اور مسلسل سفر یا پھر جیل، مہینوں گھر اور بچوں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا، بس ایک دھن تھی، ایک جنون تھا، ایک نشہ تھا کہ اپنے مشن کے لئے جان لڑا دو بس آندھی بن کر اٹھے اور بادل کی طرح برس گئے۔



سید عطاء اللہ شاہ بخاری



سیاست کیا ہے؟

"ہاں میں جانتا ہوں، سیاست کے معنی ہیں مکر، کلام اللہ میں بھی یہی معنی بیان ہوئے ہیں۔ میں نے لفظ سیاست سے زیادہ کوئی شریر لفظ نہیں دیکھا۔ یہ خدع و فریب کے ایک ایسے اجتماعی کاروبار کا نام ہے جس سے بابو لوگ اغراض کی دکان چمکاتے ہیں" (امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ۔)

ایک کہانی ایک تاریخ

شورش کاشمیری مرحوم

شاہ جی ان لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگی ماضی میں بسر ہوتی ہے اور جو ایک خاص اُسلوب زندگی کے باوصف مجموعۂ اضداد ہوتے ہیں۔ ان شخصیتوں کا صحیح تأثر ان کے قرب ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

شاہ جی کے چہرے مہرے سے عنان خیال معاً ان یونانی فلسفیوں کی طرف مڑتی ہے جن سے فکرو نظر کی بہت سی راہیں صدیوں کی کھینچاتانی کے باوجود روشن ہیں اور جن کے تصویری پیراہن ان شہ دماغوں کی یاد دلاتے ہیں جن کی صورتوں سے ایک دلاویز طنطنے کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہ جی کا نک سک قرون وسطیٰ کے اُن حکما وفقہا اور علما و خطبا سے مشابہ ہے جو طلوع تاریخ سے پہلے یونان و روما میں اور طلوع تاریخ کے بعد بغداد و دہلی میں پائے جاتے تھے۔

سوال مماثلت کا نہیں فرق مراتب بھی ظاہر ہے لیکن ایک عجیب اتفاق ہے کہ بعض داعی شخصیتیں آپس میں ایک گونہ مماثلت ضرور رکھتی ہیں۔ مثلاً فیثا غورث، کارل مارکس، رابندر ناتھ، ٹیگور اور شاہ جی میں فکر و نظریا علم و عمل کی کوئی راہ بھی مشترک نہیں لیکن سنگ تراش کا ایک ایسا بانکپن ضرور ہے جس سے ان کے عمومی خدوخال ہر صفاتی بُعد کے باوجود ایک سے ہیں۔

ان بڑوں کی زندگی ایک خاص چال رکھتی ہے۔ جس کے سانچے میں بھی ڈھلیں ہمیشہ ابھرے ہوئے ملیں گے یہ کسی کے نقش پا کی تلاش نہیں کرتے بلکہ خود لوگ ان کے نقش پا کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

شاہ جی کی زندگی جس نہج پر اُستوار ہے اس میں ادب و سیاست کا ایک رومانی امتزاج ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک رومانی آدمی کی زندگی کھلی کتاب ہوتی ہے۔ اس میں ادق عبارتیں سرے سے ناپید ہوتی ہیں۔ وہ جذبات پر جیتا اور جذبات پر مرتا ہے۔ اس میں احساس کی شدت اور استغنا کی شرافت تاحد کمال ہوتی ہے۔ اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کون اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے اس کی ذات ہی اس کا پیمانہ ہے وہ گردو پیش سے متأثر ہوتا اور چاہتا ہے کہ گردو پیش اس سے متأثر ہوں اس کی روح اس وقت معراج پر ہوتی ہے جب وہ عام چہروں میں اپنا ہی عکس دیکھتا ہے۔

ایک چراغ است دریں خانہ کہ از پر تو آں
ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ اند

۱۹۴۷ء کا ذکر ہے غالباً مارچ کا مہینہ تھا۔ عام فسادات پنجاب میں بھی پھوٹ چکے تھے۔ شاہ جی اس سے تو خوش تھے کہ انگریزوں کے چل چلاؤ کا زمانہ ہے لیکن اس کا انہیں بہت ہی دکھ تھا کہ خون خرابہ بے قابو ہو چکا ہے۔

ہمارے اصرار پر وہ امرت سر سے چلے آئے اور دفتر احرار لاہور میں مقیم تھے۔ دن بھر محفلیں جمتیں۔ گئی رات تک دربار لگا رہتا۔ عام عقیدت مند جمع ہوتے اور ان کے انوارِ سخن سے جھولیاں بھرتے لیکن ان دنوں ان کے

چہرے پر ہنسی کے آثار بہت تھوڑے تھے۔

اس سے پہلے وزارتی مشن کے زمانے میں ہم کوئی دو ماہ دہلی میں اکٹھے رہے تھے اور وہ زمانہ اپنی بو قلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار حصہ تھا۔ میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ میری بعض یادداشتیں ادھوری ہیں اگر آپ اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالیں تو یہ یادداشتیں مکمل ہو سکتی ہیں لیکن وہ طرح دے گئے ان کے نزدیک اس کی ضرورت ہی نہ تھی وہ تحریر کو ایک فتنہ سمجھتے اور اپنے اس عقیدے کو ہمیشہ دہراتے ہیں کہ جب سے حافظہ کی جگہ تحریر نے لے لی ہے نہ صرف انسان کو عقلی اعتبار سے ضعف پہنچا ہے بلکہ ہر کہیں عجیب الخلقت تنازعوں کی آب و ہوا پھیل گئی ہے وہ عام لوگوں کی طرح اس دور کو ترقی کا دور نہیں کہتے بلکہ ان کے نزدیک یہ خسران کا دور ہے اور تحریر اس خسران کی پیچ دار بنیادوں میں سے ایک۔

بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے؟ مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگزشت لکھ دی ہے۔

بدنامیِ حیات دو روزے نہ بود بیش
آں ہم کلیم با تو چگویم چساں گزشت
یک روز صرف بستنِ دل شد باین و آں،
روزے دگر بکندنِ دل زین و آں گزشت

تفصیل طلب کیجیے تو مسکرا دیں گے، آغا فہمیدیم اور بس۔۔۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف ہے۔ مولانا اپنے سے باہر جھانکتے نہیں اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مولانا کے لئے تخلیہ صحبت عیش ہے۔ شاہ جی کے لئے جان کنی، مولانا کتابوں کی رفاقت کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں کرپاتے۔ شاہ جی نے عمر بھر کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے۔

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

یہاں لاہور میں ان کی آزردگی بڑھتی ہی گئی۔ ہر دن ایک نیا سانحہ لاتا۔ پہلے انہیں ہندوستان کی بربادی کا غم تھا۔ اب وہ مسلمانوں کے لئے بے چین تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو تیاری کے بغیر ایک ایسی آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس کا واحد نتیجہ ہمہ گیر تباہی ہے۔ وہ کلکتہ، نواکھالی اور بہار کے حالات سے پہلے ہی مغموم تھے۔ اب جن حالات میں خضر وزارت کا استعفا ہوا تھا اور اس استعفا سے پہلے مسلم لیگ نے جو مظاہرے اور مجاہرے برپا کئے تھے۔ شاہ جی کی طبیعت پر ان کا ایک منفی اثر تھا۔ فسادات جنگل کی آگ تھے اور وہ انسانی خون کا تماشا دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ فرماتے:

"بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب کا رکنا محال ہے"

خضر وزارت کے خلاف بلاناغہ احتجاجی جلوس نکل رہے تھے۔ ان جلوسوں میں زبان خلق کی ساری خصوصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ شاہ جی مغرب کے وقت دفتر کے چھجے میں آکھڑے ہوتے، ان مظاہروں کا نظارہ کرتے اور جب بے قابو نوجوانوں کی آوازیں شفق میں گھلنے لگتیں تو سرد آہ بھرتے اور کہتے:

"شورش! مجھے صاف نظر آرہا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ دور دور تک آگ لگی ہوئی ہے، مکان جل رہے، دکانیں لوٹی جارہی اور قزاق عصمتیں اڑائے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ ماں بیٹے کو چھوڑ چکی، باپ بیٹی کو ہار چکا ہے۔ چاروں طرف قیامت کا صور پھک گیا ہے"

پھر ایکا ایکی ملنگوں کے انداز میں نعرہ گونجانے لگتے:

"کردے چٹیل میدان مولا کردے چٹیل میدان" لعنت بر پدر فرنگ اور فرنگ پر خاص زور دیتے۔ تبریٰ کی یہ آواز کبھی کبھار شاہ محمد غوث کی مسجد سے اٹھتی ہوئی آذان

سے جا ٹکراتی۔ نیاز مند شاہ جی کے اس قلندرانہ نعرے پر مسکراتے اور شاہ جی جھنجھلا کر فرماتے:

"میاں آج ہنستے ہو کل روؤ گے۔ تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں دیکھ رہا ہوں جو کچھ بیت رہا اور جو کچھ بیتنے والا ہے۔ ایک وبا پھوٹ چکی، ایک وبا آرہی ہے۔ تب ان کی زبان پر قرآن مجید کی آیتیں جاری ہوجاتیں۔ ان کی قرات میں گداز پیدا ہوجاتا۔ ان کے لحن میں آنسو آجاتے اور ہم تھے کہ ان کا منہ تکا کرتے۔ ہمارا وجدان شہادت دیتا کہ فقیر غلط نہیں کہ رہا ہے لیکن عقل سپر انداز ہونے سے [illegible] کرتی۔ "جی نہیں شاہ جی حالات ابھی اتنے خراب نہیں۔ انگریزوں کا مفاد۔۔۔؟"

وہ فقرہ ہی توڑ لیتے۔

"ہاں بھائی انگریزوں کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کوئلہ ہوجائیں، لوگ قتل ہوں۔ آخر جانے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کر ہی جائے گا۔ تم نے آزادی مانگی تھی یہ لو آزادی۔۔؟ یہ اس کی پہلی قسط ہے"۔

شاہ جی! سیاست؟

"ہاں میں جانتا ہوں، سیاست کے معنی ہیں مگر کلام اللہ میں بھی یہی معنی بیان ہوئے ہیں۔ میں نے لفظ سیاست سے زیادہ کوئی شریر لفظ نہیں دیکھا۔ یہ خدع و [illegible]

آزادی کی پہلی قسط

تقسیم سے قبل حالات کی سنگینی بھانپتے ہوئے شاہ جی نے آغا شورش کاشمیری سے فرمایا "شورش!۔۔۔مجھے صاف نظر آرہا ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ دور دور تک آگ لگی ہوئی ہے، مکان جل رہے، دکانیں لوٹی جارہی اور قزاق عصمتیں اڑائے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ ماں بیٹے کو چھوڑ چکی، باپ بیٹی کو ہار چکا ہے۔ چاروں طرف قیامت کا صور پھک گیا ہے"۔

"کردے چٹیل میدان مولا کردے چٹیل میدان"۔۔۔۔ لعنت بر پدرِ فرنگ اور فرنگ پر خاص زور دیتے۔ تبرّیٰ کی یہ آواز کبھی کبھار شاہ محمد غوث کی مسجد سے اٹھتی ہوئی اذان سے جا ٹکراتی۔۔۔ نیاز مند شاہ جی کے اس قلندرانہ نعرے پر مسکراتے اور شاہ جی جھنجھلا کر فرماتے:

"میاں آج ہنستے ہو کل روؤ گے، تم نہیں دیکھ سکتے، میں دیکھ رہا ہوں جو کچھ بیت رہا ہے اور جو کچھ بیتنے والا ہے۔ ایک وباء پھوٹ چکی، ایک وباء آرہی ہے تب ان کی زبان پر قرآن مجید کی آیتیں جاری ہوجاتیں، اُن کی قرأت میں گداز پیدا ہوجاتا، اُن کے لحن میں آنسو آجاتے اور ہم تھے کہ ان کا منہ تکا کرتے۔ ہمارا وجدان شہادت دیتا کہ فقیر غلط نہیں کہ رہا ہے لیکن عقل سُپر انداز ہونے سے انکار کرتی۔ "جی نہیں شاہ جی حالات ابھی اتنے خراب نہیں۔ انگریزوں کا مفاد۔۔۔۔؟

وہ فقرہ ہی توڑ لیتے۔

"ہاں بھائی انگریزوں کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کوئلہ ہوجائیں، لوگ قتل ہوں۔ آخر جانے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کر ہی جائے گا۔ تم نے آزادی مانگی تھی یہ لو آزادی۔۔۔؟ یہ اس کی پہلی قسط ہے"

زیب کے ایک ایسے اجتماعی کاروبار کا نام ہے جس سے بابو لوگ اغراض کی دکان چمکاتے ہیں"

اور میں جی ہی جی میں سوچ کر چپ ہو رہتا۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

عام حالات میں یہ باتیں بے وزن تھیں۔ جس شخص کی نصف زندگی خود سیاست میں گزری ہو پھر جس نے "قبرستانوں" میں "اذانیں" دی ہوں۔ ان کا سیاست کے بارے میں یہ ذہن ایک لطیفہ ہے۔ یہ ذہن انہوں نے تحریک خلافت کے بیٹھ جانے پر زعمائی کرتوت سے متأثر ہو کر قائم کیا۔ اس پر سختی سے قائم ہیں اور تقسیم ملک کے بعد تو وہ سیاست ہی کو منکرات میں سے سمجھتے ہیں۔ گو تحریک خلافت کے بعد بھی انہوں نے سیاست میں حصہ لیا لیکن اپنی مرضی سے نہیں دوسروں کی مرضی سے۔ ان کا ایک خاص معیار ہے جس سے وہ حالات کی بجائے افراد کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ حالات کیا کہتے ہیں۔ ان کے لئے بس یہ کافی ہے کہ احباب کیا کہتے ہیں جب تک دوست ان کے اعتماد کو مجروح نہ کریں وہ ان کے دماغ سے بھی سوچ لیتے ہیں۔ ملک کی سیاسی تحریکوں کے اٹھانے میں ان کے دماغی فیصلے شاذ ہی شریک ہوئے ہیں لیکن ان تحریکوں کے جگمگانے میں ان کی زبان برقی لہر ثابت ہوئی ہے۔

وہ سب سے بڑے عوامی خطیب ہیں لیکن عوام کو کالانعام ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں جدید سیاسی اصطلاحوں سے کوئی رغبت نہیں، ان کے نزدیک تحریکات میں عوامی قوت فعال ضرور ہوتی ہے لیکن سرچشمہ نہیں وہ نتائج کو مشیت ایزدی کے تابع سمجھتے ہیں۔ ان کی بے نیازی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ انہیں اخبارات سے نفرت ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اخباروں نے آغاز سے اب تک بڑے بڑے جھوٹ گھڑے ہیں۔ اگر اس جھوٹ کا بوجھ ماؤنٹ ایورسٹ پر پڑتا تو وہ بھی زمین میں دھنس چکی ہوتی۔ انہیں اشتہار دینے یا بننے سے سخت نفرت ہے۔ ایسی کوئی ترغیب یا تحریص انہیں بے راہ نہیں کر سکتی اور نہ وہ خوشامد ہی سے رام ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ انسان کی ملعون کمزوریاں ہیں۔ یہاں بڑے بڑے تخلیہ دوست، رہنما اور گوشہ نشین مہاتما بھی اخباروں میں چھپنے کی آرزو سے بے نیاز نہ رہ سکے لیکن وہ ایک تنہا نظر آتے ہیں جنہیں اس کوچے سے رسم و راہ رکھتے ہوئے عار آتی ہے۔ وہ غصہ میں اس کو جہنم کی آگ کہہ اٹھتے اور ہمیشہ اس سے کنی کتراتے ہیں۔

"بابو! میں اس میدان کا کھلاڑی نہیں"

اور جب کوئی فوٹو گرافر ان کی تصویر لینا چاہے تو چہرے پر رومال ڈال لیں گے یا ڈانٹ کر بٹھا دیں گے۔ کیا کرتے ہو میاں؟ یہ میری تصویر بنا کر کیا کرو گے؟ میری تصویر میرے افکار ہیں، میرے خیالات کو اتار سکتے ہو تو دل کے فوکس میں اتار لو یہ سب سے اچھی تصویر ہوگی۔ دنیا میں نہ سہی عاقبت میں کام آئے گی اور ہاں میری تصویر۔۔؟

بیٹا پاس بیٹھا ہو تو اس سے کہیں گے، "کھڑے ہو جاؤ شاہ جی!"

پھر فوٹو گرافر سے مخاطب ہوتے ہوئے۔۔

"میری تصویر میرا بیٹا ہے اس کو دیکھ لو"

"اور ہاں میری نظر سے دیکھنا! کتنی اچھی تصویر ہے"؟

خود عمر بھر میں ایک ہی تصویر کھنچوائی ہے۔ دو چار تصویریں اور بھی ہیں لیکن سب چوری چھپے کی، وہ تصویر کا رکھنا اور کھنچوانا شرعاً ممنوع سمجھتے ہیں۔ انہیں مُصوّری اور عکّاسی کی خلقی اور غیر خلقی بحثوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ اُسے کٹ حجتی سمجھتے ہیں اور جب ان سے یہ کہیں کہ فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت ہے) کی

تصویریں عام ہیں تو وہ مسکرا دیں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا مقلد تھا۔ شریعت میں نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں، بابو! میرے میاں نے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب اقوال ہیچ ہیں۔"

اور وہ میاں کے لقب سے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ امی وابی) کو یاد کرتے۔

راقم نے عرض کیا:

"شاہ جی! آپ تو کرتے کے ساتھ شلوار پہنا کرتے تھے لیکن یہ کچھ دنوں سے آپ نے تہ بند پہننا شروع کر رکھی ہے؟ فوراً ہی بات کاٹ لی"

"بھائی حضور کا لباس ہے، میاں صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے"

ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد ہر سوال ختم ہو جاتا ہے۔ شاہ جی کی دو تہائی زندگی سیاسیات میں کٹی ہے۔ ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا ہے۔ اُن دنوں کے سوا جو قید خانے میں بسر ہوئے کوئی دن بھی تقریر کے بغیر نہیں گزرا۔ سینکڑوں قومی و ملکی مسائل پیدا ہوئے، ہر مسئلے میں لوگوں سے کہا سنا لیکن بیان بازی سے گریزاں ہی رہے۔ جہاں اور جب نامہ نگاروں نے گھیرا فقرو ہو گئے۔ ان تیس بتیس برس میں انہوں نے اخبارات میں کسی عنوان سے کبھی کوئی بیان نہیں دیا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی میں ایک دلچسپ خموشی ہے۔ مجلس احرار نے اپنا اخبار جاری کیا لیکن وہاں بھی کبھی کوئی بیان نہیں چھپوایا جو بیان یا پیغام ان سے منسوب ہیں۔ ان میں بھی، اُن کی منشا ہے، قلم نہیں۔ راقم کے علم میں صرف ایک مثال ایسی ہے جو اس سے مستثنٰے ہے اور وہ ایک خط ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد روزنامہ "آزاد" میں انکے قلم سے نکلا تھا۔ تقریباً تمام بڑے ایڈیٹروں سے ان کے تعلقات رہے لیکن چھپنے چھپانے سے فرار ہی کیا۔ کہیں کسی نامہ نگار نے گھیر لیا، کوئی سٹاف رپورٹر آ نکلا۔ کسی نمائندے سے ٹکر ہو گئی اب وہ سوال کر رہا ہے۔ شاہ جی انڈیا ایکٹ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ شاہ جی دامن بچا رہے ہیں۔۔۔

کتنی اچھی تصویر ہے

جب کوئی فوٹو گرافر شاہ جی کی تصویر لینا چاہے تو چہرے پر رومال ڈال لیتے یا ڈانٹ کر بٹھا دیتے اور فرماتے کیا کرتے ہو میاں؟ یہ میری تصویر بنا کر کیا کرو گے؟ میری تصویر میرے افکار ہیں، میرے خیالات کو اُتار سکتے ہو تو دل کے فوکس میں اتار لو یہ سب سے اچھی تصویر ہو گی۔ دنیا میں نہ سہی عاقبت میں کام آئے گی اور ہاں میری تصویر۔۔۔۔؟ اپنے بڑے فرزند سید ابو معاویہ مدظلہ جو پاس بیٹھے ہوتے انکو فرماتے کھڑے ہو جاؤ حافظ جی۔

پھر فوٹو گرافر سے مخاطب ہوتے۔۔۔۔۔۔

"میری تصویر میرا بیٹا ہے اس کو دیکھ لو"

"اور ہاں میری نظر سے دیکھنا! کتنی اچھی تصویر ہے"؟

---"بھائی میں آج کل قرآن مجید کی فلاں آیت پر غور کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے فلاں فلاں مفسر نے اس بارے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ البتہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ میں بات اُبھرتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر سامنے نہیں، غالباً انہوں نے بھی اُن سے اتفاق کیا ہے۔"

اخبار نویس پوچھتا ہے:

"دو قومی نظریہ کے مسئلے میں آپ علامہ اقبال سے متفق ہیں یا مولانا حسین احمد مدنی سے؟ آپ نے بحث تو دیکھی ہوگی؟--- بھائی میں نے جانبین کے فرمودات کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ آج کل بیاض کھنگالنے میں لگا ہوں۔ کوئی ۳۵ برس پہلے "جب آتش جوان تھا"، یہ بیاض مرتب کی تھی۔ سنو یہ شعر کس قدر پیارا ہے۔

ہر کسے را دامن تر ہست اما دیگراں
بازمی پوشند و ما درا آفتاب انداختیم

اخبار نویس: "شاہ جی عالمی وفاق کا قیام ممکن ہے؟ جمہوریت اس وفاق کا ذریعہ بن سکتی ہے یا فسطائیت یا اشتمالیت"؟

لیکن شاہ جی موڈ کے آدمی ہیں وہ آپ کو یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیں گے کہ انہوں نے عصری تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں؟ ان کے نزدیک ہر چیز کی ایک ہی ترازو ہے۔ اور وہ ہے، قرآن مجید، اسوۂ رسول، سیرۃ صحابہ اور علمائے امت کا فہم و تدبر۔ اُن ائمہ اربعہ کے سوا جن کی فقہ چلتی ہے وہ کسی جدید فقہ کے قائل نہیں۔ ان کا واحد معیار اسلاف ہیں۔ اس دور کی بیشتر تحریکیں ان کے نزدیک ذہنی بدکاری ہیں۔ انہوں نے سرے سے ان تحریکوں کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ ان کے بارے میں اُن کی معلومات محدود اور بالواسطہ ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی بالکل نہیں جانتے اور عصری تحریکوں کا علم انگریزی میں رسوخ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ہے، گو ایک حد تک انگریزی زبان کے مزاج سے آشنائی بھی اس خلا کو پورا کرتی ہے۔ لیکن شاہ جی دونوں سے دست کش ہیں---

ان کا تعلق دیوبند کے اس مدرسۂ فکر سے ہے جس نے انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام قرار دیا تھا۔ وہ دیوبند کے فارغ التحصیل نہیں لیکن ان کی ذہنیت کا خمیر اسی خاک سے اٹھا ہے جن اکابر علماء نے سرسید کے مشن کی مخالفت کی وہ ان پر ہزار ہزار رحمتیں بھیجتے ہیں۔ اُن کے عقیدہ میں خرابی کی اصل جڑ انگریزی تعلیم ہے جس نے مسلمانوں کے بدن سے "روح محمد" نکال لی ہے اگر اس خرابی کو اس وقت روک لیا جاتا تو آج نقشہ مختلف ہوتا اور مسلمان اس طرح نہ گرتے جس طرح گر چکے ہیں پھر ان کا یہ خیال معناً درست ہے کہ زبان کے بدلنے سے انسان بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عربوں نے جن ملکوں کو فتح کیا وہاں کی زبان عربی بنا ڈالی اور عام باشندے اسلامیات میں گھل مل گئے۔ جہاں عربی زبان کا تسلط نہ ہوا وہاں جہانبانی کی مدت گزرتے ہی عمارت بیٹھ گئی۔ ہندوستان کی نظیر سامنے ہے۔ یہاں اسلام حکمرانوں کی معرفت نہیں بلکہ اہل اللہ کی وساطت سے آیا۔ لیکن عام آبادی میں اسلامی فکر رچ بچ نہ سکا۔ نتیجہ معلوم کہ قاہرہ ہمیشہ کے لئے اسلام کا شہر ہوگیا اور دہلی اس شرف سے محروم ہی رہا۔ جن مسلمان خاندانوں نے ہندوستان میں حکومت کی ان کا اسلام کئی واسطوں سے متاثر تھا۔ وہ اسلام کی اصل زبان سے بھی ناآشنا تھے۔ خود فارسی کے مسلمان ہونے میں دیر لگی اور قبول اسلام کے باوجود اس میں عجمی رنگ برقرار رہا۔ اس کی کوکھ سے اردو پیدا ہوئی جس نے خاص قسم کے اثرات پیدا کئے باوجودیکہ ان زبانوں کے بنانے اور بولنے والے مسلمان تھے لیکن زبان مسلمان ہو گئی۔ اسلام اردو نہ ہوسکا۔ انگریزی کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ اولاً نصاریٰ کی زبان، ثانیاً فاتحوں کی بولی، ثالثاً اسے وہ لوگ لے کر آئے تھے جو کلیسا کے ردِ عمل سے نفس مذہب

کے خلاف اُبھرتی ہوئی تحریکوں کے ہر اول تھے۔ حد یہ کہ صنعتی انقلاب نے زبان کا مزاج ہی بدل ڈالا تھا۔۔۔ ان حالات میں جن علماء نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے روکا اور ان میں اس کے خلاف ایک عموم تحریک کی نیو اٹھائی۔ ان کے ذہن میں یقیناً حالات کا ... رابیوں کا یہ نقشہ ہوگا۔ لیکن اب دنیا ایک صدی آ... بڑھ چکی ہے اور آج انگریزی کو دنیا میں وہی عروج حاصل ہے جو کبھی عربی کو تھا، پھر انگریزی محض ایک زبان ہی نہیں رہی بلکہ سائنسی انکشافات کی طرح ناگزیر ہو گئی ہے لیکن شاہ جی کو اس سے اتفاق نہیں، ان کے نزدیک انگریزی پڑھنا پڑھانا دونوں حرام ہیں۔

ایک دفعہ ... یں نے ان کے بچوں سے متعلق عرض کیا:

"شاہ جی! انہیں انگریزی پڑھائیے، انگریزی مدرسوں میں بھیجئے اور ممکن ہو تو وکیل بنائیے آئندہ معاشرے کی باگ ڈور قانون دانوں کے ہاتھ میں ہے"۔

بس اس پر بگڑ بیٹھے:

"تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ انہیں زندہ دفنا دو۔۔۔

لعنت بر پدر فرنگ" اور یہ اُن کا قلندرانہ نعرہ ہے۔

۔۔۔ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی ایک خاص کھیپ سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں ہندوستان ایک تھا تو ان کے نیازمندوں میں بڑے بڑے کمیونسٹ اور سوشلسٹ (ہندو اور مسلمان) شامل تھے۔ ان کی ایک بڑی جمعیت کو ہمیشہ آپ سے لگاؤ رہا۔ سبھی آپ کا احترام

آپکا علاج گولی ہے

دوسری جنگ عظیم کے د... میں دہلی دروازہ لاہور ... باہر حکومت الٰہیہ کے موضوع پر بول رہے تھے۔ جانے کیونکر اشتراکیوں کا ذکر آ گیا۔ کسی نے لقمہ دیا، حضرت ان کا تو عقیدہ ہے کہ زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خدا کو نکال دو۔

بس پھر کیا تھا، گھنگریالے بالوں کو جھٹکا دیا، پہلے ہنسے اور پھر تاؤ میں آ گئے۔

"ٹھیک ہے بھائی! ٹھیک ہے، ہائے اکبر الہ آبادی کس وقت یاد آ گئے۔۔۔ (لے کے ساتھ)

صدیوں فلاسفہ کی چُناں اور چُنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

کہاں خداوندِ ایزد متعال کہ "کن کے لفظ سے کائنات پیدا کی، کہاں روس، تو سے پروانہ اسپند، الٹا دو تو سوّر ہو جائے"

بات کچھ نہیں محض الفاظ کا اُلٹ پھیر تھا لیکن اس ایک اداء نے مجمع کو گرویدہ کر لیا، نعرہ ہائے تکبیر گونج اٹھے، اسی سحر سے خوف زدہ ہو کر ڈاکٹر اشرف نے ایک دفعہ شاہ جی سے کہا تھا" آپ لوگوں پر جادو کرتے ہیں جن سے ان کے سوچنے کی قوتیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔ آپ کا علاج گولی ہے"۔

کرتے لیکن نہ وہ انہیں ہم خیال بنا سکے اور نہ یہ انہیں قائل معقول کر سکے۔ دونوں کے درمیان جذباتی رشتہ رہا۔ ان میں سے اکثر آپ کے صحبت یافتہ ہیں۔ مثلاً منشی احمد دین سوشلسٹوں کے سب سے بڑے مقرر تھے۔ ان کا سیاسی راستہ ہمیشہ ہی مختلف رہا لیکن خطابت میں شاہ جی ہی کے خوشہ چین تھے۔

شاہ جی کمیونزم کو بھی اسلام کے خلاف یہودیوں کی لامتناہی سازشوں کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کارل مارکس یہودی تھا اور یہودی ہمیشہ سے اسلام کے خلاف سازشیں کرتے آئے ہیں۔ اس ضمن میں وہ اسلام کے خلاف کی گئی سازشوں کی پوری تاریخ اپنے خطیبانہ جوش میں بیان کر جاتے ہیں۔ ان کی یہ باتیں نئی نسل کے لئے سطحی ہوتی ہیں یا اجنبی یا پھر جذباتی لیکن ان کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا ہے کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

کارل مارکس نسلاً یہودی ضرور تھا لیکن اس نے انسان کے اجتماعی اور انفرادی دکھ کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جس کی اساس جدلیات پر ہے۔ صیہونت پر نہیں، مگر شاہ جی تاریخ کی مادی تعبیر، طبقاتی کش مکش، جدلیات اصول اور سرمایہ و محنت کے معاشی مبحث، کو اپنی خطابت میں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

ع این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی

جس تحریک یا جماعت میں خدا نہ ہو، اخلاقی قدریں اضافی سمجھی جائیں اور پیغمبر صرف مادی حالات کی تاریخی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آئے ہوں۔ شاہ جی اس تحریک یا جماعت کے داعیوں پر غضب ناک ہو کر لپکتے ہیں۔ عام اشتمالی نوجوانوں کو وہ گمراہ محض خیال کرتے ہیں۔ لیکن دکان دار علماء کی طرح وہ نہ تو سرمایہ داری کا جواز پیدا کرتے ہیں اور نہ بڑی زمینداریوں ہی کے حق میں ہیں۔ ان کے نزدیک زمینیں خدا کی ملکیت ہیں اور جو لوگ ان پر ہل جوتتے ہیں وہی از روئے اسلام ان کے حقدار ہیں۔ جس نظام معیشت سے بھی استحصال پیدا ہو وہ اس کے سخت خلاف ہیں۔ انہیں خونیں انقلاب برپا کرنے میں بھی عار نہیں۔ لیکن ان کے نزدیک رہنما "قرآن" ہے، "سرمایہ" نہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں دہلی دروازہ لاہور کے باہر حکومت الہیہ کے موضوع پر بول رہے تھے۔ جانے کیونکر اشتراکیوں کا ذکر آ گیا۔ کسی نے لقمہ دیا، حضرت ان کا تو عقیدہ ہے کہ زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خدا کو نکال دو۔

بس پھر کیا تھا، گھنگریالے بالوں کو جھٹکا دیا، پہلے ہنسے اور پھر تاؤ میں آ گئے۔

"ٹھیک ہے بھائی! ٹھیک ہے، ہائے اکبر الہ آبادی کس وقت یاد آ گئے۔۔ (لے کے ساتھ)

صدیوں فلاسفہ کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

کہاں خداوند ایزد متعال کہ "کن" کے لفظ سے کائنات پیدا کی۔ کہاں روس، توے پر دانۂ اسپند، اٹھا دو تو سُوں ہو جائے"

بات کچھ نہیں محض الفاظ کا اُلٹ پھیر تھا لیکن اس ایک اداء نے مجمع کو گرویدہ کر لیا، نعرہ ہائے تکبیر گونج اٹھے۔ اسی سحر سے خوف زدہ ہو کر ڈاکٹر اشرف نے ایک دفعہ شاہ جی سے کہا تھا "آپ لوگوں پر جادو کرتے ہیں جن سے ان کے سوچنے کی قوتیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔ آپ کا علاج گولی ہے"۔

شاہ جی بعض عجیب و غریب خصوصیتوں کا مجموعہ ہیں۔ ان کی باتیں جب وہ کسی تحریک کے افکار و حالات پر گفتگو کر رہے ہوں تو سیاسی ترازو میں ٹھیک نہیں بیٹھتی ہیں۔ لیکن نتائج کے اعتبار سے اس طرح صورت پذیر ہوتی

ہیں کہ لوگوں کو ان کے ملہم ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ بظاہر ان باتوں میں عقلی بندشیں سست ہوتی ہیں لیکن قلندرانہ شوخیاں حرف حرف سے پھٹی پڑتی ہیں۔ اُن کی یہ درویشی جس سے سیاست کو دور کی نسبت بھی نہیں۔ ان لوگوں میں جھنجلاہٹ پیدا کرتی ہے جو سیاست کو مادیات کے آئینے میں دیکھتے ہیں لیکن اس جھنجلاہٹ کے باوجود جب نتیجوں کی منزل سامنے آتی ہے تو ان باتوں کا بہت بڑا حصہ صحیح ہوتا ہے۔ خضر وزارت ٹوٹی تو ان کی پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہونے لگیں۔۔۔!

!۔۔۔ چڑھتے دن سے گئی رات تک وہ مکانوں سے اٹھتے ہوئے شعلوں کا نظارہ کرتے، کوئی پوچھ لیتا تو فرماتے:

"میاں کیا پوچھتے ہو، شعلے نہیں ٹِوانوں کے ٹڑّے ہیں ٹڑّے"

شاہ جی نے فسادات کے آغاز ہی میں امرتسر چھوڑ دیا تھا۔ امرتسر سے کوئی دوست آتا تو اس سے کہتے: وہاں کیا رکھا ہے چلے آؤ، جو خط کھنچ چکا ہے وہ اب مٹنے کا نہیں۔۔۔ مجھے دیکھو حرف معطل ہو گیا ہوں۔۔۔

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

عام طور پر ایک ہندو اور ایک مسلمان اخبار پڑھتے تھے لیکن اب وہ التزام بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اخبار مل گیا، پڑھ لیا۔ نہ ملا، تو دوستوں سے خبریں معلوم کر لیں یا ریڈیو سن لیا۔

!۔۔۔ ان کی سفری کائنات ایک چھوٹا سا بستر، ٹین کا بیمار بکس، بید کی ٹوکری، تانبے کا لوٹا اور گول سا پاندان ہے۔ کوئی نئی کتاب مل جائے تو جب تک پڑھ نہ لیں، ساتھ ہی رکھتے ہیں ان دنوں "غبار خاطر" کا دستخطی نسخہ ہمراہ تھا، اس کا مطالعہ شروع کیا تو اپنی کہانی بھی کہنے

میری Contribution کیا ہے؟

ایک دوست نے حضرت شاہ جی سے سوال کیا۔ "ملکی سیاسیات میں آپ کی Contribution کیا ہے اور آزادیٔ ہندوستان کا وہ کون سا مثبت نظریہ ہے جس کے لیے آپ کوشاں ہیں؟"

شاہ جی نے فرمایا۔۔۔۔ "یہ فیصلہ تو آپ کیجئے کہ میری Contribution کیا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہن سے انگریزوں کو نکال پھینکا ہے۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے وہاں پہنچا ہوں جہاں دھرتی پانی نہیں دیتی۔ رہا یہ سوال کہ آزادی کا وہ کون سا تصور ہے جس کے لیے میں لڑ رہا ہوں تو سمجھ لیجئے کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔ آپ غالباً مجھ سے کسی کتابی آئیڈیالوجی کا پوچھ رہے ہوں گے؟ بابو۔۔۔ یہ کتابی نظریے عموماً روگ ہوتے ہیں، فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وہ کسی مثبت تصور کا نہیں، منفی تصور کا ہے۔ ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلوخلاصی حاصل ہو۔ اس ملک سے انگریز نکلیں۔ نکلیں کیا؟ نکالے جائیں تب دیکھا جائے گا کہ آزادی کے خطوط کیا ہوں گے؟ آپ تو نکاح سے پہلے چھوارے بانٹنا چاہتے ہیں۔

گئے۔ حافظہ کی گرہیں کھلنے لگیں۔ عربی، فارسی، اردو، پنجابی اور ملتانی میں انہیں بے شمار شعر، مثنویاں، قصیدے، مسدس، مخمسیں، مرثیے، نوحے، نعتیں، غزلیں، نظمیں از بر ہیں اور مولانا آزاد کی طرح اپنے حافظے پر انہیں بھی بڑا ناز ہے۔

"یہ اشعار آج سے کوئی تیس سال پہلے پڑھے تھے، فلاں شعر شاد عظیم آبادی سے سنا تھا۔ اب تک یاد ہے۔ نظیری کے فلاں فلاں شعر نانا مرحوم کے بیاض سے نقل کئے تھے۔ میاں! فارسی کا ذوق تو اب عنقا ہو رہا ہے۔ ادھر اردو بھی اب نئے نئے تجربوں کی زد میں ہے۔ شاعری نے ایک نیا بچہ جنا ہے، نظم مُعریٰ یا نظم آزاد، مرزا غلام احمد کی نبوت اور نظم مُعریٰ میرے لئے ناقابل فہم ہیں۔ لعنت بر پدر فرنگ!

مدت العمر پنجابی کی شوخ و شنگ شاعری کا شوق رہا۔ لیکن عمر کے ساتھ ہاتھ اٹھا لیا۔ ایک دفعہ مولانا آزاد کو ہیر وارث شاہ کا ایک بند سنایا۔ اس وقت تو مولانا عادتاً ہاں میرے بھائی کہ کر چپ ہو رہے لیکن دس بارہ برس بعد ملے تو فرمایا: "شاہ جی کوئی کہہ رہا تھا آپ تقریر میں گالی دینے لگے ہو؟"

"حضرت، آپ سے کس نے کہا؟"

"میرے بھائی، نام تو یاد نہیں آرہا، بہر حال کوئی صاحب ضرور تھے۔"

"تو حضرت، آپ نے اعتبار کر لیا؟"

•"میرے بھائی اعتبار کی بات نہیں، ایک زمانہ میں آپ نے ہیر وارث شاہ کے چند شعر سنائے تھے، ان میں کچھ ایسے ہی کلمات تھے۔ میں نے سمجھا شاید زبان ڈھلک گئی ہو"۔

اب لے دے کے بُلھے شاہ کی کافیاں یاد ہیں یا بابا فرید کا کلام، اور وہ بھی جستہ جستہ جس زبان میں بابا فرید شعر کہتے ہیں وہ دو ضلعی زبان ہے اور مقابلتہً دشوار، بلھے شاہ سریع الفہم ہیں اور ان کے ہاں صاف گوئی زیادہ ہے۔

سچ کہندیاں بھانبڑ مچدا اے

"ہاں بھائی سچ کہنا فرنگی کے دور میں بہت بڑا جرم ہے۔"

"جی نہیں شاہ جی ہر دور میں جرم ہے"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو بھائی لیکن ہمارا معاملہ تو اس دور سے ہے"۔

میں چاہتا تھا شاہ جی اس موضوع پر کُھلیں اور میں اُن پر بزعم خود ثابت کروں کہ انسان کو اس دور میں مقابلتہً زیادہ حقوق و مراعات حاصل ہیں اور پہلے تمام دور سیاستہً گھناؤنے اور ڈراؤنے تھے۔ میں نے ان سے کہہ ہی دیا۔ شاہ جی مسلمان بادشاہوں نے بھی تو راستباز زبانوں کے کاٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی؟ آج جن لوگوں کو تاریخ اسلام کی سب سے بڑی شخصیتیں کہا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ حکام اور عوام نے یکساں برتاؤ کیا آج استبداد کی اجتماعی حمایت میں کم سے کم عوام تو شریک نہیں ہوتے؟

"میاں! یہ سب کچھ میں نے بھی پڑھا ہے۔ تم فرنگی بابا کو نہیں جانتے، اس نے روحیں قتل کردی ہیں، روحیں، اسلام اٹھ گیا مسلمان رہ گئے ہائے اکبر کس وقت یاد آیا (لے میں)

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ان کے ہاں بھی اکبر الہ آبادی کے سے احتجاجی لیکن منفی جذبات ہیں لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو ایک مصلح اور انقلابی میں ہوتا ہے۔ اکبر مسکرا کر چٹکی لیتے اور شاہ جی جھنجلا کر تھپڑ مارتے ہیں۔ ان کے دل میں ہمیشہ کے لئے یہ گرہ پڑ چکی ہے کہ انگریز سے بڑا دشمن اسلام کوئی نہیں۔ ان کے سامنے اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی پوری تاریخ ہے۔ انہوں

نے سیاسیات میں قدم رکھا تو پہلی جنگ عظیم کے نتائج آنکھوں کے سامنے تھے جو خیالات ورثہ میں پائے وہ استعمار کے مخالف علماء کے خیالات تھے۔ خلافتِ عثمانیہ جس طرح پارہ پارہ ہوئی اور عربی ملکوں میں قومیت کے نام پر جو گل کھلائے گئے۔ ان کی انگریزوں سے برگشتگی کے لئے کافی تھے۔ ہندوستان میں تحریک خلافت اور جلیانوالہ باغ کے حادثے نے مہمیز کا کام کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ ان کا کہنا ہے کہ قاسم نانوتوی اور محمود حسن رحمہما اللہ تعالی نے ایک راستہ دکھایا تھا۔ میں تو توشۂ آخرت کے لئے اُسی پر چل رہا ہوں۔ مجھے اُسی کے لئے جینا اور اُسی پر مرنا ہے۔

حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے مے خواہد
ورنہ مارا بہ جہانِ تو سرو کار کجاست

الغرض ان کی ذات ربع صدی تک انگریزوں کے خلاف ایک تحریک بنی رہی ہے اس لحاظ سے وہ ایک ادارہ ہیں۔ انہوں نے ایسے علاقوں میں انگریز دشمنی کے بیج بوئے ہیں۔ جہاں انکے اپنے الفاظ میں اور گو یہ الفاظ کسی قدر سخت ہیں: "پنجابی مائیں بڑی چاہت سے ٹوڈی بچے جنتی ہیں۔"

ایک دوست نے ان سے سوال کیا۔ "ملکی سیاسیات میں آپ کی contribution کیا ہے اور آزادیٔ ہندوستان کا وہ کون سا مثبت نظریہ ہے جس کے لئے آپ کوشاں ہیں؟"

شاہ جی نے فرمایا۔۔۔ "یہ فیصلہ تو آپ کیجئے کہ میری contribution کیا ہے میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہن سے انگریزوں کو نکال پھینکا ہے۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے۔ وہاں پہنچا ہوں جہاں دھرتی پانی نہیں دیتی۔ رہا یہ سوال کہ آزادی کا وہ کون سا تصور ہے جس کے لئے میں لڑ رہا ہوں تو سمجھ لیجئے کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔ آپ غالباً مجھ سے کسی کتابی آئڈیالوجی کا پوچھ رہے ہوں گے؟ بابو۔۔۔ یہ کتابی نظریے عموماً روگ ہوتے ہیں، فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وہ کسی مثبت تصور کا نہیں، منفی تصور کا ہے۔ ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلو خلاصی حاصل ہو۔ اس ملک سے انگریز نکلیں۔ نکلیں کیا نکالے جائیں۔ تب دیکھا جائے گا کہ آزادی کے خطوط کہاں ہوں گے؟ آپ تو نکاح سے پہلے چھوارے بانٹنا چاہتے ہیں۔ پھر میں کوئی دستوری نہیں، سپاہی ہوں تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سُوّر بھی میری مدد کریں گے تو

"خود کاشتہ پودے کی آبیاری"

میں کوئی دستوری نہیں، سپاہی ہوں تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سُوّر بھی میری مدد کریں گے تو میں انکا منہ چوم لوں گا۔ میں تو اُن چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لیے تیار ہوں جو "صاحب بہادر" کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم میرا ایک ہی دشمن ہے۔ انگریز۔ اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی ہمیں غلام رکھا اور مقبوضات پیدا کیے بلکہ خیرہ چشمی کی حد ہو گئی کہ قرآن حکیم میں تحریف کے لیے مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کیا، پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی اور اب اس کو چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے۔"

ہیں ان کا منہ چوم لوں گا۔ میں تو ان چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لئے تیار ہوں جو "صاحب بہادر" کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم میرا ایک ہی دشمن ہے۔ انگریز، اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی ہمیں غلام رکھا اور مقبوضات پیدا کئے بلکہ خیرہ چشمی کی حد ہو گئی کہ قرآن حکیم میں تحریف کے لئے مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کیا، پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی اور اب اس کو چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے۔"

ان کی اس جھنجھلاہٹ میں ایک قسم کی جارحانہ لگن ہوتی ہے جو باتیں اقبال نے قلندرانہ رنگ میں کہی ہیں اور جن میں "پیچ و تاب رازی" کے بجائے "سوز و ساز رومی" کی شدت مضمر ہے۔

اقبال و اکبر کی مثالیں یہاں اس لئے زیر قلم آئی ہیں کہ قارئین شاہ جی کی سیرت کے اس پہلو کو آسانی سے سمجھ لیں اکبر اور اقبال دونوں کا مشن ایک تھا لیکن دونوں کا طرز بیان مقاصد میں ہم آہنگی کے باوصف مختلف رہا۔ اقبال کا انداز عقلی ہے، اکبر کا جذباتی، اکبر ایک گرتی ہوئی دیوار سے دل برداشتہ ہو کر گردو پیش کے ظواہر پر سنگ دلانہ قہقہے لگاتے ہیں لیکن انہوں نے کسی مدرسۂ فکر سے عقیدے کے طور پر بعض معلوم سچائیاں حاصل کی ہیں۔ ان کی انگریزوں پر چوٹیں ایک مسلسل مطالعے اور لگاتار مشاہدے کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

کرے قبول اگر دین مصطفے انگریز
سیاہ روز مسلمان رہے گا پھر بھی غلام

گویا اقبال کے علم و نظر کی معراج اس خیال پر ختم ہوتی ہے جس خیال کو شاہ جی کے ہاں محض عقیدہ کا درجہ حاصل ہے اور جو جذبہ سے شروع ہو کر جذبہ ہی پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ جی کا یہ جذباتی سراپا انتہائی دلاویز ہے انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد کی بنیاد محض اس اصل پر نہیں رکھی کہ وہ ایک استعماری قوت ہے اس کا نو آبادیاتی نظام استحصال محض ہے اور وہ دنیا کے سب سے بڑے سامراج کی مظہر ہے۔ ان کی بنیاد مخاصمت میں بعض دوسری باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں مثلاً

"۱۸۵۷ء کا غدر اور وہ اسے "غدر" کہنے والوں کو غدار کہتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی، شہزادوں کا خونی دروازوں پر لٹکایا جانا، آزاد قبائل کے پٹھانوں پر انگریزوں کی مسلسل بمباری، گیلی پولی کے مقام پر مصطفیٰ کمال کے خلاف کھروں، ٹوانوں اور نونوں کی نبرد آزمائی، قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کا بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جانا، غلاف کعبہ کا جلنا، مہدی سوڈانی کا خرطوم کے صدر دروازے پر سولی پانا، اس کی لاش کا جلایا جانا اور راکھ کا اڑانا، شاہ عبدالقادر جیلانی کے بغداد پر گولہ باری اور حرم کے کبوتروں کا زخمی ہونا۔۔"

ان سانحات کو قرآن و حدیث سے اس طرح نکھارتے ہیں کہ ہزارہا لوگ گھنٹوں دم بخود بیٹھے رہتے اور ان کے اعجاز بیان پر سر دھنتے ہیں۔

"شاہ جی اپنی سوانح عمری ہی لکھیے؟"

"کس کے لئے۔۔؟

"ہمارے لئے"۔

"آخر تیس بتیس برس تم لوگوں میں جھک مارتا رہا ہوں۔ اس سے تم نے کیا حاصل کیا کہ اب چند اوراق کی کہانی سے حاصل کر لو گے؟"

"اچھا اپنے لئے لکھیے"۔

"میں لکھی لکھائی کہانی ہوں، ہر روز اپنے کو پڑھ لیتا ہوں"۔

"شاہ جی اس طرح بہر حال ایک تاریخ ہو جائے گی"

"پھر وہی بات؟ تاریخ کیا؟ اور کس کے لئے؟ پہلے ہی لوگوں نے تاریخ کے کس حصے سے سبق لیا ہے کہ اب

اپنی زندگی لکھنے بیٹھوں؟"

"شاہ جی یہ زبان "کا نہیں "قلم "کا زمانہ ہے!"

"ٹھیک ہے بھائی! لیکن کیا لکھوں کیا؟

"کچھ تو کہیے کہ زمانہ گوش بر آواز ہے"۔

"ہائے ذوق ساری سوانح عمری تو اس شعر میں کہہ گیا ہے۔ (لے میں)

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

"چلیے اس شعر کو طراز عنوان بنا کر بسم اللہ کیجئے"۔

"خوب! آخر صافی ہونا؟ قلم اٹھایا اور صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے۔ زندگی میں محض سوانح ہی نہیں ہوتے؟ کچھ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں؟ بعض گفتنی، بعض ناگفتنی، ناگفتنی میں کام کی کوئی چیز نہیں اور گفتنی میں خطرات ہی خطرات ہیں۔

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم پختہ شدم، سوختم!

آج سے چوتھائی صدی پیشتر ایک سفر شروع کیا تھا۔ تب بے شمار لوگ شریک راہ تھے۔ ہر پڑاؤ پر قافلہ گھٹتا ہی رہا حتیٰ کہ

منزل عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی!
تھک تھک کے اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

کچھ دوست راستہ بدل گئے کچھ اپنے ہی تعاقب میں پیچھے لوٹ گئے۔ اکثر بچھڑ گئے، بیشتر بچھڑ گئے۔

اے ہم نفساں آتشم از من بگریزید
ہر کس کو شود ہم رہ ما دشمن خویش است

دوستوں سے فریب نہیں کیا، دشمنوں سے انتقام نہیں لیا۔ ذاتی دشمن بنائے ہی نہیں اور نہ بننے کی کوشش کی۔ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو گیا کہ انگریز دوست ہے۔ اس سے کنارہ کیا۔ جس نے ملی مقاصد سے بدعہدی کی۔ اس سے علیک سلیک کو بھی عار سمجھا، اب اس عمر میں لوگوں اور شہروں کے خمیر و ضمیر سے واقف ہو گیا ہوں ـــــ ان کو بہت قریب سے پہچانتا ہوں لیکن اور جب امید نہیں تو شکایت کس سے؟

صد بیاباں بگزشت و دگرے درپیش است۔

سارے سفر کا حاصل ہے لگاتار چالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا، پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اٹھتے، چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں، سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لئے طوفان بکنار ہوجاتے، درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے، کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہ اٹھتیں، صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہوجاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے، جنگل لہرانے لگتے۔ صحرا سبز ہوجاتے۔ میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کیلئے بنجر ہوچکی تھیں۔ جن کے ضمیر عاجز آچکے ہیں۔ جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے جن کی پستیاں انتہائی خطرناک ہیں۔ جو صرف طاقت کی پوجا کرتے ہیں۔ تیرہ سو برس کی تاریخ انہی حادثوں کی کہانی ہے انہیں چھوڑے ناسمجھ نازک اور متحرک جانوروں کو دیکھ کر زرتشت نے کہا تھا کہ

اس کا آنسوؤں اور گیتوں کی طرف میلان ہوتا ہے۔۔ یہاں امراء دوزخ کے کتے اور سیاستدان کھٹی تے ہیں۔ ان کے ساتھ نٹ اور ان کے پیچھے لاشیں چلتی ہیں۔ ان کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور ہر برائی کی زبان میں جھٹ بول لیتے ہیں۔"

میاں بابو! ڈھونڈ سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بنیادیں ڈھونڈ لو

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اور نظر بہ ظاہر گرامی کا یہ مصرع بھی اسی اجمال کی شرح

ہے۔

زدی کشتی شکستی سوختی انداختی رفتی

الغرض انہیں اپنی ناکامیوں کا شدید احساس ہے۔ حتیٰ کہ اس آزردگی کے آثار اب ان کے چہرے سے بھی عیاں ہیں۔ ان کی متحرک اور روشن آنکھیں جن میں عمر ڈھلنے تک ساری مستی شراب کی سی تھی۔ اب اندر کو دھنس چکی ہیں۔ ان کے ماتھے کے بے شمار سلوٹیں جن میں ہزیمت کی ترشی منجمد ہے۔ اپنے ماضی کے بوجھ سے مضمحل ہیں۔ آواز میں وہ کرارا پن اب بھی ہے لیکن کمر کی خمیدگی پکارتی ہے۔

ع لگا کے آگ کوئی کارواں روانہ ہوا

۱۹۴۷ء کا زمانہ رستخیز سب سے طویل عرصہ تھا جو انہوں نے ایام قید کے علاوہ ایک ہی جگہ نشست جما کر بسر کیا وہ چند ماہ دفتر احرار میں ٹھہرے رہے مگر اس اثنا میں کتاب کے جتنے ورق تھے ایک ایک کر کے کھل گئے۔ وہ اپنی کہانی لکھیں تو حقیقتاً بڑے بڑے وقائع نگاروں کا اثاثہ مفلس کا چراغ معلوم ہو۔ انہوں نے ہندوستان کا ہر کونہ کھدرا چھان مارا ہے۔ وہ بعض صوبوں ہی کی نہیں بلکہ شہروں، قصبوں، گاؤں اور بازاروں تک کی بولی ٹھولی محاورہ و روزمرہ جانتے ہیں۔ انہوں نے انگلیوں پر گنی ہوئی کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن انسان اتنے پڑھے کے ہندوستان میں کوئی بڑے سے بڑا عوامی لیڈر بھی اس خصوصیت میں ان کا ہمسر نہیں۔ اس دوڑ میں وہ مہاتما گاندھی اور قائداعظم سے بھی منزلوں آگے ہیں لیکن گاندھی جی کے الفاظ میں تالیاں پیٹنے والے مسلمان ان کے ساتھ رہے اور ووٹ دینے والے مسلمان قائداعظم کے ساتھ۔ انہیں ہندوستان کی بہت سی زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ انہیں ہزاروں لطائف یاد ہیں۔ حاضر جوابی اور برجستہ گوئی میں اتنے مستعد ہیں کہ ان سے کئی کتابیں مرتب ہوسکتی ہیں۔ پنجاب کی بعض اصلاعی بولیاں تو ان کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی ہیں۔ ان کی گفتگو سے یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ اردو بولیں، تو اہل زبان کا لب و لہجہ گھلا جاتا ہے۔ قرآن پڑھیں تو قرأت سے عرب ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ پنجاب بولتے وقت منہ سے موتی جھڑتے ہیں۔ غرض ہر ضلع کی بولی نوک زبان ہے۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

اکثر شخصیتوں کے قرب سے ان کا ملمع اتر جاتا ہے لیکن شاہ جی کے قرب سے ان کا سونا اور دمکتا ہے۔ وہ بے پناہ ہیں۔ ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہو گئی ہیں۔

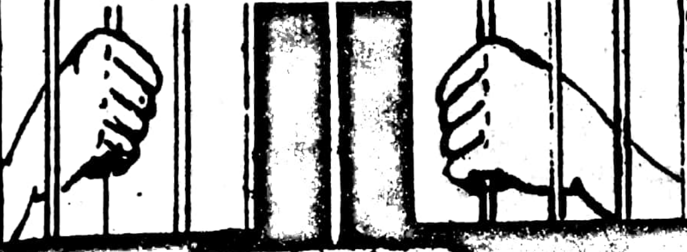
یاد نہیں رہا۔ کون؟ لیکن ایک مصنف نے اپنے ممدوح کی سوانح عمری کے دیباچے میں لکھا ہے:
"ان کے حالات زندگی لکھنا ایسا ہے جیسے تیرتھ یاترا؟"

شاہ جی تیرتھ نہیں لیکن ان کی یاترا سے ایک ایسے تیرتھ کا احساس ضرور ہوتا ہے جس میں صدیوں سے ایک ہی آواز گونج رہی ہے

تیز رکھنا سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مجموعہ خطابت بطلِ حریت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے

عزم و ہمت — حق و صداقت — جرأت و استقامت — قربانی و ایثار کا مرقع





اور

غلامی سے آزادی تک کی

داستانِ حریت



جانشین امیر شریعت

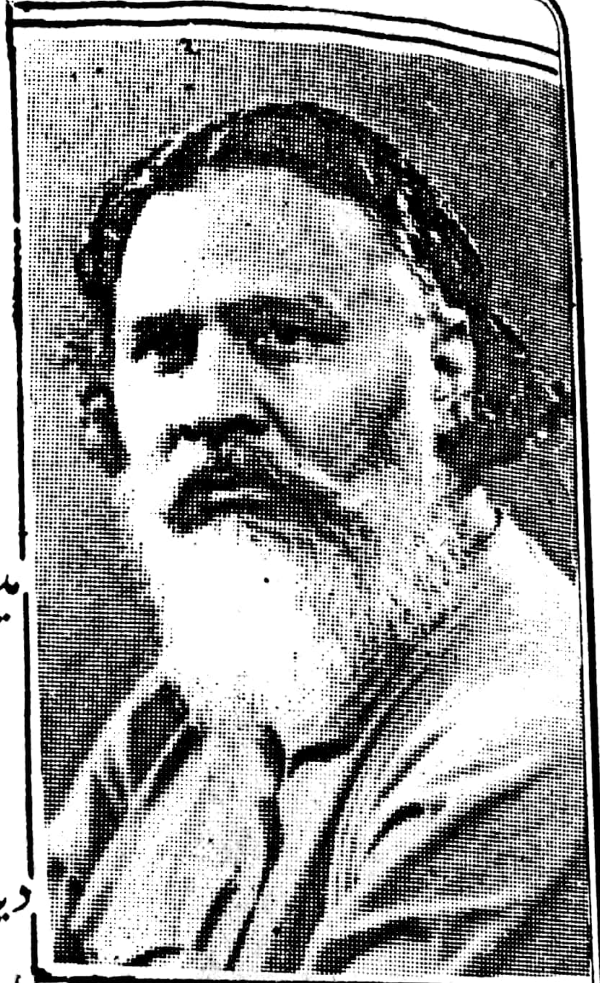
سید ابو معاویہ ابوذر بخاری

— کے قلم سے —

قیمت —— ٣٥ روپے

محدود تعداد ہے





میری زندگی ہی کیا ہے؟



میں کیا ہوں؟ نہ نبی ہوں نہ ولی، خدا کی، مخلوق میں سب سے بُرا اور عاجز، میرے گناہوں پر مالک نے پردہ ڈال دیا ہے۔ ورنہ عطاء اللہ جیسے کروڑوں مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں کوئی جانتا تک نہیں۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے قرآن کی کچھ خدمت مجھ سے لے لی اور اس پر بھی کوئی دعویٰ نہیں۔ استغفراللہ۔ پوری زندگی میں نے کہا ہوا اگر کوئی ایک حرف بھی قبول ہو گیا تو نجات ہو جائے گی۔ انشاء اللہ نجات کی اُمید ضرور رکھتا ہوں۔ کیوں کہ اتنا مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کے سوا کسی خدا کو نہیں مانا، اور میاں (حضور علیہ السلام) کے بعد کسی بدمعاش کو اُنکا حریف بنتے دیکھنا میں برداشت نہیں کرسکتا، اور کوئی عمل میرے پلّے نہیں بس اُسی کے فضل و کرم کے سہارے جی رہا ہوں" ●●●●



انگریز کا دشمن۔ بنیا ازم کا مخالف۔ حریتہ کاملہ اور آزادی کا داعی ایک مجاھد، ایک عالم، ایک روحانی پیشوا اور ایک سیاسی رہنما بطل جلیل امیر شریعتہ

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

جناب اشرف عطاء

کتنے دور آئے اور ختم ہو گئے۔ کتنی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں اور عدم آباد میں ابدی نیند سو گئیں۔ کتنی حکومتیں بنیں اور انقلابات کی نذر ہو گئیں۔ تاریخ کے اوراق میں ان کے کارناموں کی مناسبت سے ان کا ذکر ہو تو ہو لیکن گردش زمانہ نے عوام کے دماغوں سے اُن کی یاد محو کر دی ہے لیکن کچھ ایسی شخصیتیں بھی جنہیں انسان بھولنا بھی چاہے تو بھول نہیں سکتا۔ ان میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری کا نام سر فہرست ہے۔ شاہ صاحب کے کارنامے ان کی قربانیاں، ان کا ایثار، ان کی باغ و بہار طبیعت، ان کے لطائف، ان کے ادب پارے، ان کی طنز، ان کا مزاح اور پھر فارسی، عربی اور اردو کے شعراء کے ہزاروں اشعار جو انہیں از بر تھے ان اشعار کی ادائیگی۔ ان کی قادیان شکن تقریریں، برطانوی جبر و استبدار کے سامنے خم ٹھونک کر ہر قسم کے نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر ان کی ہندوستان گیر جدوجھد، یہ وہ واقعات ہیں جنہیں کوئی شخص آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بُلبلِ گلستانِ رسالت ﷺ تھے۔ اللہ رب العزت نے انہیں لحنِ داؤدی عطاء کر رکھا تھا۔ وہ جب اپنی تقریر کے دوران تلاوت قرآن مجید کرتے تو شجر و حجر وجد میں آجاتے۔ شاہ صاحب کا عربی فارسی اور اُردو کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہیں اردو، فارسی اور عربی کے اساتذہ کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔ الفاظ و معانی کا ایک سیلاب تھا جو ان کی تقریروں میں امڈا چلا آتا تھا۔ شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے ننہال کے ہاں عظیم آباد (پٹنہ) میں مکمل کی۔ عظیم آباد اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ اس کے چپہ چپہ پر تاریخ اسلام کے اوراق بکھرے ہوئے ہیں۔ عظیم آباد کی سرزمین نے بڑے بڑے ادباء، فضلاء، علماء اور شعراء پیدا کئے جن کے رشحات قلم نے ہمارے سرمایۂ ادب میں بے پناہ اضافہ کیا۔ شاہ صاحب کے ننہال کا گھرانہ خود علم و فضل کے میدان میں بہت شہرت رکھتا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب پر اپنے ننہال کا ادبی اور علمی اثر ہمیشہ غالب رہا۔

شاہ صاحب نے ہوش سنبھالا تو عظیم آباد سے امرتسر اپنے والد بزرگوار کے ہاں اُٹھ آئے۔ آپ کے دادھیال علماء کا گھرانا تھا اور ان کے ہاں پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ روحانی طور پر اس گھرانے کو امرتسر میں اچھی خاصی شہرت حاصل تھی۔ اور اس گھرانے کے عقیدت مندوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا گھرانا گجرات کے سادات سے تعلق رکھتا تھا لیکن آپ پٹنہ سے ہجرت کر کے آگئے تھے اور امرتسر ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ شاہ صاحب عظیم آباد سے امرتسر پہنچے تو والد نے جن کی یہ

انتہائی خواہش تھی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے علماء میں ہو، تو آپ کو مفتی محمد حسن رحمتہ

جب امیر شریعتہ امر تسر کی مسجد خیر الدین میں پڑھا کرتے تھے ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد امر تسر کے اخبار "وکیل" کے مدیر اعلیٰ ہوا کرتے تھے۔

اللہ علیہ کے سپرد کیا۔ مفتی محمد حسن ولی اللہ تھے۔ عالم بے بدل تھے ان کے مکتب نے بڑے بڑے رہنماؤں اور عالموں کو جنم دیا۔ انگریز دشمنی، ان کی نس نس میں بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ کے حلقۂ درس سے جو طالب علم بھی نکل کر سیاست کے میدان میں جادہ پیما ہوا اس کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں ہوا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بے حد ذہین تھے۔ انہوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے مفتی صاحب کا دل موہ لیا۔ ایک روز مفتی صاحب نے اپنے حلقہ درس میں فرمایا۔

"عطاء اللہ شاہ مستقبل میں ایک تاریخی شخصیت ثابت ہوگا۔ اور ملت اسلامیہ کے مُردہ قلوب میں زندگی کا نیا جوش، نیا ولولہ اور نیا خون دوڑا دے گا"۔

حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مسلمانان ہند کے قلوب میں نیا جوش، نیا ولولہ، نئی تڑپ پیدا کرنے میں جو عظیم کردار ادا کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں حریت کا قیمتی سرمایہ ہے۔

جب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ امر تسر کی مسجد خیر الدین میں پڑھا کرتے تھے ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد امر تسر کے اخبار "وکیل" کے مدیر اعلیٰ ہوا کرتے تھے اور آغا حشر عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرے کیا کرتے تھے۔ آغا حشر اپنے دور کے بہت بڑے مناظر تھے۔ وہ عظیم شاعر بلند پایہ ڈرامہ نویس ہی نہیں تھے بلکہ ایک شعلہ نوا مقرر اور جادو بیان خطیب بھی تھے۔

شاہ صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کی اُن دنوں کی جبکہ وہ "وکیل" میں مدیر تھے۔ تصویر کچھ اس طرح سے کھینچا کرتے تھے۔

"ایک سرو قد رعنا صورت، بڑی بڑی مدھ بھری آنکھوں کا نوجوان، لباس صاف ستھرا اور اجلا۔ اور اس کی نفاست طبع کا آئینہ دار باتوں میں ٹھہراؤ اور قلم میں انگارے مضمر تھے۔ کسی مسئلہ پر بات کرو تو معلومات اور دلائل و براہین کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگے۔ خطابت کا شہنشاہ، تحریر کا دھنی، ایک عظیم شخصیت، دینی، علمی، ادبی، شعری، سیاسی، بین الاقوامی اور بین المسلکی کوئی معاملہ ہو۔ اس پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتا کہ اس کا ہر الجھاؤ دور ہوجاتا اور اس کی ہر گتھی سلجھ کر سامنے آجاتی۔ علم و ادب کا یہ آفتاب پوری آب و تاب سے آسمانِ ہند پر چمکا۔ اس کے سامنے سب کی قندیلیں مدھم پڑ گئیں۔

وہ امام الہند تھا۔ اس کا مقام مذہب و سیاست میں بہت بلند تھا۔ وہ ایک گلِ شگفتہ تھا جس کی بو باس سے گلستانِ ملت کو تروتازگی ملی۔

ایک روز باتوں باتوں میں کہنے لگے میں نے آغا حشر کو اس عالم میں بھی دیکھا ہے کہ وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح عیسائی، آریہ، سماجی اور دہریہ مبلغوں پر جھپٹتا۔ محمد شاہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ جب وہ

تقریر کرتا تو الفاظ و معانی کے دریا بہا دیتا تھا۔ جب دلائل و براہین سے کام لیتا تو اس کے مخالف اس سے پناہ مانگتے۔ اسے مختلف مذاہب کی کتابیں از بر تھیں۔ اس نے آریہ سماجی اور عیسائی لٹریچر کا عمیق نظروں سے مطالعہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائی پادری اور آریہ سماجی اس کے مقابلے میں آنے سے کتراتے تھے۔ شکوہ یورپ کا یہ **مخالف** ہر طرف دندناتا پھرتا۔ کوئی مقابلہ پر نہ آتا۔ یہ قدرت کی انتہائی ستم ظریفی ہے کہ اس نے حشر ایسا مناظر۔ خطیب، مقرر، محقق ملّت سے چھین لیا اور اسے ڈراموں کی دلدلوں میں پھنسا دیا۔ حشر جب تک زندہ رہا۔ ڈرامہ نویسی کی دنیا میں اس کا طوطی بولتا رہا۔ یقیناً وہ اپنے وقت کا شیکسپیئر اور کالیداس تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ابھی مسجد خیر الدین میں حضرت مفتی محمد حسن کے حلقہ درس میں ہی شامل تھے کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی اور پھر انگریزوں نے عراق، دمشق، فلسطین، اردن وغیرہ عرب ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ مشرق وسطیٰ پر ہلالی پرچم کی جگہ تثلیث کا جھنڈا لہرانے لگا۔ مقامات مقدسہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اتحادیوں نے خلافت عثمانیہ کے لبادے کو تار تار کر دیا۔ ترک جو پانچ سو سال تک یورپ کے سینے پر مونگ دلتے رہے تھے۔ شکست کھا گئے۔ استنبول پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ عثمانی خلیفہ کی حیثیت ایک محکوم حکمران کی ہو کر رہ گئی۔ ان واقعات نے مسلمانوں کے قلوب میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کا ایک طوفان موجزن کر دیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی حقوق اور آزادی دینے کے سلسلہ میں جو وعدے جنگ کے دوران کئے تھے۔ وہ اپنے ان وعدوں سے منحرف ہو گیا۔ اس نے ہندوستانیوں کی وفاداری اور قربانی کا یہ صلہ دیا کہ ملک میں رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص جو سلوک کیا اس کے نتیجہ میں سارے ملک میں حکومت کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان مظاہروں نے شدت اختیار کی تو جلیانوالہ باغ کا خونی واقعہ رونما ہوا۔ مسلمانوں نے احیائے خلافت کے سلسلہ میں

اتحاد کیسے ہو سکتا ہے؟

● میں بُت شکن ہوں اور ہندو بُت پرست! ——————

میں ایک خدا کی پرستش کرتا ہوں اور وہ ہزاروں خود ساختہ خداؤں کے سامنے سر جھکاتا ہے، ——————

میری اور اُس کی روایات مختلف ہیں پھر میرے اور اسکے درمیان اتحاد کیسے ہو سکتا ہے؟

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی (راجپال ایجی ٹیشن کے دوران ایک تقریر)

تحریک شروع کی اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام مقامات مقدسہ کو مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ ترکی اور عرب ممالک سے اتحادی فوجوں کو نکال لیا جائے اور ترکی اور عرب ممالک کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے۔

تحریک خلافت کو چلانے کے لئے ملک میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ خلافت کمیٹی میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں، عبدالرحمٰن صدیقی، سید راغب حسن اور مولانا ثناء اللہ پانی پتی۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، آغا محمد صفدر سیالکوٹی، شیخ دین محمد، شیخ حسام الدین، ملک لال خان، سیٹھ چھٹانی، جان محمد بیرسٹر، حسین شہید سہروردی، مولوی فضل الحق، چوہدری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر، سید برجیس فیروز پوری، بشیر ہندی، صوفی غلام محمد ترک، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، علمائے دیوبند اور علمائے فرنگی محل سب ہی شامل تھے۔ یہ تحریک آندھی کی طرح اٹھی اور طوفان کی طرح پورے ملک پر چھا گئی۔ مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کی تو گاندھی جی نے جو جنوبی افریقہ سے ہندوستانی آنے کے بعد گوکھلے تلک اور سی آر داس ایسے لیڈروں کی قیادت کے گھروندے گرانا چاہتے تھے ملک میں عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔ ترک موالات اور خلافت تحریک کے الحاق نے برطانوی حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔

تحریک خلافت میں مولانا عطاء اللہ بخاری میدان سیاست میں تشریف لائے۔ انہوں نے مسجد خیر الدین میں ایک زناٹے دار تقریر کی۔ اُن کی تقریر کیا تھی ایک لاوا تھا جس نے ہر طرف آگ لگا دی۔ ان کی دوسری تقریر بھاٹی دروازہ کے باغ میں ہوئی۔ اس جلسہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، مولانا ظفر علی خاں، آغا صفدر نے بھی تقریریں کیں۔ یہ وہ رہنما تھے جن کی خطابت پر کوئی شخص انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جن کی خطابت مسلم تھی لیکن جب ان تقریروں کے بعد سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر شروع کی تو ہر شخص شاہ صاحب کو حیرت کی

چوہدری افضل حق اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے میدانِ سیاست میں لانے کا سہرا شاہ صاحب کے سر ہے۔

نظروں سے دیکھنے لگا۔ گورے چٹے رنگ اور دوہرے بدن کا ایک نوجوان تھا جس نے چوڑی آستینوں کا کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا اور تہمد زیب تن تھا۔ سر پر رومال لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھوں میں ایک ڈنڈا تھا۔

تلاوت قرآن مجید کرنے کے بعد جب شاہ صاحب نے تقریر شروع کی تو ان کے ایک ایک فقرہ پر ساری فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ انہوں نے برطانوی ملوکیت کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ اس تقریر کے بعد شاہ صاحب کی دھاک بڑے بڑے لیڈر بھی مان گئے۔ اور ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں ہونے لگا۔

تحریک خلافت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں نے نہ صرف پنجاب اور سرحد میں بلکہ پورے ہندوستان میں آگ لگا دی۔ علمائے فرنگی محل نے ان دنوں فوج اور پولیس کی نوکری حرام کا فتویٰ دیا۔ یہ تحریک انتہائی پرجوش تھی۔ اس کی وجہ سے طلباء نے سرکاری سکول اور کالج ترک کر دیئے، وکلاء نے پریکٹس چھوڑ دی۔ پولیس اور فوج کے سینکڑوں افسروں اور

سپاہیوں نے ملازمت ترک کردی۔ انہی زمانہ میں گڑھ شنکر میں شاہ صاحب کی ایک تقریر کی بنا پر چوہدری افضل حق نے جو پولیس میں ایس ایچ او تھے۔ ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور تحریک میں شامل ہوگئے۔

چوہدری افضل حق اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے میدان سیاست میں لانے کا سہرا شاہ صاحب کے سر ہے۔ جن کی تقریر نے مجھے گرویدہ بنا کر اسلام اور ملک و ملت کا شیدائی بنادیا۔

تحریک خلافت میں شاہ صاحب کو تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ان کے خلاف اس تحریک کے دوران اور بھی مقدمات چلائے گئے لیکن سزا صرف ایک مقدمہ میں ہوئی۔

تحریک خلافت اور ترک موالات کے بعد ملک میں ہندو مہاسبھائیوں اور آریہ سماجیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کردیں۔ راجپال، سوامی شردھانند، بھولا ناتھ اور ناتھورام نے لاہور، دہلی، کلکتہ اور کراچی سے ایسی کتابیں شائع کیں جن میں مسلمانوں کے آقا و مولا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخیاں کی گئی تھیں۔ شاہ صاحب عاشق رسول ﷺ تھے وہ بھلا یہ کب برداشت کرسکتے تھے۔ انہوں نے دھلی دروازہ کے باہر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ زبان گدی سے نکال لی جائے گی جو ہر نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرے گی۔ مہاشاؤں کو معلوم

ھندو یہ کیوں بھول گیا کہ اس نے ایک ہزار سال تک ہمارے آستانۂ جلال پر خاصیہ فرسائی کی ہے۔

ہونا چاہیے کہ وہ ایسی کتاب اور مضامین کی اشاعت کرکے آگ کے شعلوں سے کھیل رہے ہیں۔ مسلمان ہر چیز برداشت کرسکتا ہے لیکن اپنے آقا و مولا کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کرسکتا"۔

آپ نے اس جلسہ میں اپنی ٹوپی کو ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ "ہندو فطرتاً غلام واقع ہوا ہے۔ وہ ایک ہزار سال سے غلام چلا آرہا ہے۔ وہ آزادی کا تصور تک نہیں لاسکتا لیکن مجھے تو آج بھی اپنی اس دوپلی سے بادشاہت کی بو آرہی ہے۔ پھر فرمایا

"ہندو اور مسلمان کے درمیان اتحاد کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہندو جس گائے کو اپنی ماں مانتا ہے۔ اس کے

امیر شریعتؒ نے فرمایا

"جو قوم ہزار سال تک غلام رہی ہو۔ حکمرانی کا تصور تک اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ خدا کی قسم مجھے تو اب بھی اپنی اس دوپلی سے بادشاہت کی بُو آرہی ہے!"

پیشاب کو پوتر سمجھتا ہے۔ میں اس کو کھروں تک چبا جاتا ہوں۔ ہندو کی تہذیب الگ، تمدن الگ، مذہب الگ وہ ہزاروں بتوں کو پوجتا ہے۔ وہ شولنگ کے سامنے ماتھا رگڑتا ہے لیکن میں توحید کا علمبردار ہوں۔ میں ایک خدا کا

"ہندو گائے کو ماتا سمجھتا ہے اور میں اسے کھروں سمیت چبا جاتا ہوں ان حالات میں ہندوؤں سے ہمارا اتحاد دیوانے کے خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔" (سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ)

پجاری ہوں۔ بت پرستی اور توحید کبھی یکجا نہیں ہوسکتے۔ ظلمت اور روشنی میں کبھی ملاپ نہیں ہو سکتا۔

مسلمان محمود بت شکن کی اولاد ہیں۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کی روایات کے حامل ہیں۔ ہندو یہ کیوں بھول گیا کہ اس نے ایک ہزار سال تک ہمارے آستانہ جلال پر خاصیہ فرسائی کی ہے یہ قوم جو ڈو لے دے کر جاگیرداری کی بھیک مانگتی رہی ہے۔ آج مسلمانوں کو آنکھیں دکھا رہی ہے۔ ان کی زبان درازیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ مسلمانوں کے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کرنے کی جرأت کر رہی ہے۔ یاد رکھو وہ ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے جو مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کے خلاف قلم کو جنبش میں لائیں گے۔ وہ زبان کاٹ لی جائے گی جو ہمارے آقا و مولا کی شان میں گستاخی کرے گی۔

شاہ صاحب کو اس تقریر کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا اور دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

سائمن کمیشن کی آمد کے بعد ملک کی سیاست نے ایک بار پھر پلٹا کھایا۔ ان ہی دنوں پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی نے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے سلسلہ میں ایک

ایک ولولۂ تازہ دیا جس نے دلوں کو

کراچی کانگرس کے اجلاس میں جب ہندو لیڈروں نے جن میں سردار پٹیل پیش پیش تھا۔ نماز کے لئے کانگرس کا اجلاس ملتوی کرنے سے انکار کر دیا اور مولانا آزاد نے مسلمان لیڈروں سے مخاطب ہو کر فرمایا "جس نے نماز ادا کرنا ہے وہ پنڈال سے باہر جا کر نماز پڑھ سکتا ہے۔"

اور لیاقت علیخاں کہتے ہوئے بطور احتجاج اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے:

"اگر گاندھی کی پرارتھنا کے لئے اجلاس ملتوی ہو سکتا ہے تو نماز کے لئے بھی اجلاس ملتوی ہوا کریگا ورنہ مسلمان کانگرس سے الگ ہو جائیں گے۔"

مولانا آزاد نے احرار لیڈروں کو بہت سمجھایا کہ وہ بات کو طول نہ دیں لیکن امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کہا:

"ہندو کی یہی تنگ نظری اور ذہنیت ہے جو ہندوستان کو کبھی آزاد نہیں ہونے دے گی آج کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ ہندو اور مسلمان کی راہیں مختلف ہیں۔"

دستاویز شائع کی۔ جسے نہرو رپورٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اس رپورٹ کو مسلمانوں کے لئے ضرر رساں قرار دیا اور نہایت واضح طور پر یہ کہا کہ نہرو ایسی رپورٹ پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت ہی انگریز کی صحیح جانشین ہے۔ ہندو مسلمانوں کو اچیر اور اچھوت بنانے کی سازش کر رہے ہیں"۔ ان دنوں مجلس خلافت دونوں گروپوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک کی قیادت علی برادران کے ہاتھوں میں تھی۔ دوسری طرف پنجاب کے خلافتی لیڈر تھے۔ جنہیں علی برادران ہمیشہ پنجابی ٹولہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ پنجابی ٹولی نے جس میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری عبدالعزیز بیگو والی، چوہدری افضل حق، مولانا عبدالقادر قصوری، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، وغیرہ شامل تھے۔ نہرو رپورٹ کو تسلیم کر لیا۔

اس کے بعد پنجاب میں سخت ہنگامے ہوئے۔

نہرو رپورٹ کے حق میں اور مخالفت میں جلسے ہوئے۔ مظاہرے ہوئے۔ ان ہنگاموں کے بعد لاہور میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس دریائے راوی کے کنارے پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس سے قبل پنجاب کے خلافتی مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں جہازی بلڈنگ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں ایک جلسہ منعقد کر کے مجلس احرار اسلام قائم کر چکے تھے۔ کانگرس کے اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کو دریا برد کر دیا گیا اور مکمل آزادی کی قرار داد منظور کی گئی۔ جس کی تائید میں سردار عبدالرب نشتر، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مسز سروجنی نیڈو کی ہمشیرہ مسز نمبکر نے جو سوشلسٹ لیڈر تھیں بڑی زور دار تقریریں کیں۔ ملک میں تحریک نمک سازی شروع ہوئی تو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری دو سال کے لئے پھر جیل بھیج دیئے گئے لیکن گاندھی اروِن سمجھوتہ کے تحت دوسرے لیڈروں کے ساتھ ایک سال کے بعد رہا کر دیئے گئے۔

کراچی کانگرس کے اجلاس میں مولانا ظفر علی خاں کے اس مطالبہ کی بنا پر کہ اگر گاندھی جی کی پراتھنا کے لئے کانگرس کا اجلاس ملتوی کیا جاسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز کے لئے کانگرس کا اجلاس ملتوی نہ کیا جائے۔ مولانا ظفر علی کے اس مطالبہ کو ہندو لیڈروں نے ماننے سے انکار کر دیا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ فرمایا کہ جس شخص کو نماز پڑھنا ہو وہ اجلاس سے باہر جا کر نماز ادا کر سکتا ہے۔

احرار رضا کاروں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا

مولانا ابوالکلام آزاد کے ان الفاظ سے پنجاب کے احرار بھڑک اٹھے۔ مولانا ظفر علی خاں اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ مولانا آزاد نے مولانا ظفر علی خاں کے جانے کے بعد احرار لیڈروں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن شاہ صاحب اور چوہدری افضل حق نے ہندو کانگرسیوں کی اس ذہنیت کے خلاف بطور احتجاج کانگرس سے استعفی دیدیا اور مجلس احرار اسلام من حیث الجماعت کانگرس سے الگ ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد اسلامیہ کالج حبیبیہ ہال میں احرار کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین نے بڑی زور دار تقریریں کیں۔ اس اجلاس میں احرار اسلام نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریق انتخاب کی قرار داد منظور کی۔

کشمیر میں ڈوگروں کے مظالم اور فائرنگ کی وجہ سے درجنوں مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ خانقاہ معلیٰ میں داخل ہو کر ڈوگروں نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی۔ اس واقعہ نے مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا۔

مظلومین کشمیر کی امداد کے لئے کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی پر مرزائیوں کا قبضہ تھا۔ حکیم الامت علامہ شیخ محمد اقبال نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی فہمائش، ترغیب و تحریک پر اس کمیٹی کی شدید مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ مرزائی ایک الگ فرقہ ہے۔ اسے مسلمانوں کے معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کشمیر کمیٹی میں اُن کی موجودگی ملت اسلامیہ ہندیہ کے وسیع تر مفاد اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کے منافی ہے۔ مرزائی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور کشمیریوں میں مرزائیت کی تبلیغ کرکے انہیں مرتد بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ موچی دروازہ کے باہر محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں مرزائیوں کو کشمیر کمیٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد انجمن حمایت اسلام سے بھی مرزائیوں کا اخراج عمل میں لایا گیا۔ اس جلسہ میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ساڑھے تین گھنٹے تقریر کی۔ جس کی وجہ سے مرزائیوں کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں مسلمانوں پر واشگاف ہوگئیں۔

تحریک کشمیر شروع ہوئی اور ہزاروں احرار رضاکار جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ درجنوں احرار سرخپوش اپنے کشمیری بھائیوں کے آزادی کے لئے شہید ہوئے جن میں چنیوٹ کے شیخ الٰہی بخش بھی شامل تھے۔ جن کی شہادت نے مسلمانوں میں قربانی و ایثار کا نیا ولولہ اور جذبہ پیدا کیا۔ تحریک کشمیر کے زمانے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو دہلی کی جامع مسجد میں ایک تقریر کی بنا پر گرفتار کرکے اڑھائی سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ کمیونل ایوارڈ کے نفاذ سے مسلمان ناراض تھے اور اسے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کو مسلط کرنے کی ایک برطانوی سازش قرار دے رہے تھے۔ کانگرس نے انتخابات میں حصہ لے کر چھ سات صوبوں میں وزارتیں بنالی تھیں۔ ان صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک روا رکھا جارہا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب اور روایات میں مداخلت کی جارہی تھی اور پنڈت نہرو ایسے لیڈر انگریزوں کو للکار رہے تھے کہ انگریزوں نے اختیارات حکمرانی منتقل کرنے ہیں تو وہ کانگرس کو کرنے ہوں گے۔ کیونکہ کانگرس ہی اس ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس سے واضح تھا کہ پنڈت نہرو کہہ رہے تھے کہ اختیاراتِ حکمرانی ہندوؤں کو منتقل کئے جائیں۔ نہرو کی اس دھمکی نے مسلمانوں کو خبردار اور ہوشیار کردیا۔

شاہ صاحب پاکستان سے والہانہ محبت کرتے تھے:

چنانچہ محمد علی جناح کو لندن سے بلایا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ مسلمانوں کی قیادت اس آڑے وقت میں سنبھالیں چنانچہ لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس میں انکو لیڈر تسلیم کرلیا گیا اور ملک میں مسلم لیگ کی تحریک شروع ہوگئی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کی تحریک میں مجلس احرار اسلام کا رول انتہائی مبہم تھا احراریوں کا یہ مؤقف تھا کہ پہلے ہندوستان کو آزاد کرایا جائے پھر ہندوؤں سے نپٹا جائے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس سلسلہ میں ایک عرصہ تک خاموش رہے لیکن چودھری افضل حق اور مظہر علی اظہر نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی جماعتی طور پر شاہ صاحب اپنی جماعت کے فیصلوں کے پابند تھے۔ لیکن قلبی اور ذہنی طور پر ان کا مؤقف واضح تھا۔ جو قوم گائے کو ماتا سمجھتی ہو اور اس گائے کو میں کھروں تک چبا جاؤں اس قوم کے ساتھ میرا اتحاد ناممکن ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ شاہ صاحب نے تحریک پاکستان کی مخالفت میں بعض مواقع پر اپنی تقریروں میں اظہار خیال کیا لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کردیا کہ

شاہ صاحب وطن عزیز پاکستان کی سرزمین سے کس قدر محبت رکھتے تھے۔

۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء میں جب پنڈت نہرو نے پاکستان کی سرحدات پر فوجیں جمع کردیں اور پاکستان کی آزادی کے لئے شدید خطرہ پیدا ہو گیا تو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے احرار کانفرنس کے اجلاس میں جو دہلی دروازہ لاہور کے باہر منعقد ہوا۔ تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"پاکستان بن چکا ہے اب اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ یہ میرا وطن ہے اس کا ذرہ ذرہ میرے نزدیک مقدس ہے۔ اس کی حفاظت میرا ایمان ہے۔ اگر بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو وطن عزیز پاکستان کی آزادی کی حفاظت میں لڑنے والوں میں سب سے آگے سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہوگا۔ اس مقدس سرزمین کی آزادی کی حفاظت میں جس شخص کا سب سے پہلے خون بہے گا وہ عطاء اللہ شاہ ہوگا۔"

آپ نے اعلان کیا کہ پوری قوم لیاقت علی خاں کے ساتھ ہے۔ آپ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ سربکف اور کفن بردوش ہو کر پاکستان کے جھنڈے تلے جمع ہوجائیں اور اگر دشمن حملہ کرے تو اس کا منہ پھیر دیں۔

شاہ صاحب جب تک زندہ رہے انہوں نے پاکستان کی خوشحالی، استحکام اور سربلندی کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ شاہ صاحب نے مجموعی طور پر ساڑھے نو سال جیل کاٹی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ قدس سرہ آپ کو بلبل ریاض رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ انجمن خدام الدین کے زیر اہتمام شیرانوالہ باغ میں علماء کانفرنس منعقد ہوئی تو اس اجلاس میں مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں تمام علمائے کرام نے حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت کا خطاب دیا۔ اور سب علماء نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ "مرزائیت کے سلسلہ میں شاہ صاحب تمام عمر مصروف رہے اس سلسلہ میں آپ کے خلاف مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج کی عدالت میں مقدمہ چلا اور اس مقدمہ میں کھوسلہ نے تاریخی فیصلہ دیا۔ اس کے علاوہ مرزائیت کے خلاف تحریکوں میں آپ کے خلاف تین چار دفعہ مقدمات چلائے گئے۔ جن میں عمر قید اور پھانسی کی سزائیں ہوسکتی تھیں لیکن آپ ان مقدمات سے بری ہوجاتے رہے۔ آخری دفعہ آپ خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے عہد میں مرزائیوں کے خلاف تحریک میں دوسرے علماء کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ جس میں چودہ چودہ سال قید کی سزادی گئی لیکن سال ڈیڑھ سال کے بعد آپ کو دوسرے علماء کے ہمراہ باعزت طور پر چھوڑ دیا گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب طریقت تھے اکثر کہا کرتے تھے کہ میں حضرت پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ گولڑوی کا مرید ہوں۔ روحانی طور پر مجھے اُن سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے اپنا تعلق بیعت شیخ المشائخ حضرت عبدالقادر رائپوری قدس سرہ سے جوڑ لیا۔ اور پھر تاحیات انہی سے منسلک رہے۔ میانوالی، مظفر گڑھ، ملتان اور ڈیرہ غازی خاں میں آپ کے ہزاروں مرید تھے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ امرتسر سے ہجرت کر کے ملتان میں آکر آباد ہوئے۔ ملتان سے انہیں محبت تھی اور اکثر ملتان کے متعلق کہا کرتے تھے۔

"ملتان ولیوں، قطبوں اور عالموں کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین پر محمد بن قاسم کے قدم آئے اور اسلام کا جو پہلا لشکر برصغیر میں محمد بن قاسم کے ہمراہ آیا۔ اس نے ملتان میں ہی اپنا ڈیرہ جمایا۔ اس میں کئی بزرگ لوگ بہت مرتبہ کے تھے جن کے نقوشِ کف پا کے نشان مجھے آج بھی نظر آرہے ہیں"۔

"ملتان سے مجھے محبت ہے اس کا ماحول بالکل ایسا ہے جیسا عرب کا ہے۔ دور تک پھیلی ہوئی قبریں،

کھجوروں کے جھنڈ، اولیاء اللہ کے مقابر، غازیوں اور مجاہدوں کے مزارات مجھے اسلام کے قرن اول کی یاد دلاتے ہیں۔ جب ہم کشور کشائے عالم بن کر عرب کے ریگزاروں سے نکلے تھے اور ہمارا سیل رواں کسی سے تھم نہ سکا تھا۔

"ملتان کی سرزمین ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ جب اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو تو تمام جغرافیائی وابستگیاں بھول جاؤ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ وسیع دنیا مسلمانوں کی میراث ہے۔

فخر کی بات

۱۹۴۷ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے مہاشہ راج پال ناشر "رنگیلا رسول" کو قانون کے اصلاحی سقم پر رہا کر دیا تو مسلمانوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ انہوں نے جلسۂ عام کرنا چاہا مگر لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی نے دفعہ ۱۴۴ لگا دی شاہ جی نے شاہ محمد غوث کے بالمقابل احاطۂ عبدالرحیم میں جلسہ کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی بھی اس فقید المثال جلسہ میں موجود تھے۔ ادھر احاطے کے دروازے پر پولیس کے مسلح دستوں کا پہرہ تھا۔ شاہ جی نے تقریر شروع کی۔

"آج آپ لوگ جناب فخر رُسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے عزۃ و ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آج جنس انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے۔ آج اس جلیل المرتبت ہستی کا ناموس معرضِ خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔

آج مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کے دروازے پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ آئیں اور فرمایا: ہم تمہاری مائیں ہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں؟ کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں۔ ارے دیکھو! ام المومنین عائشہ دروازے پر تو کھڑی نہیں؟ تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج گنبد خضریٰ میں رسول اللہ تڑپ رہے ہیں۔ آج خدیجہ و عائشہ پریشان ہیں۔ بتاؤ تمہارے دلوں میں امہات المومنین کی کوئی جگہ ہے؟ آج ام المومنین عائشہ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں، وہی عائشہ جنھیں رسول اللہ حمیرا کہہ کر پکارا کرتے تھے جنھوں نے سید عالم کو وصال کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ اگر تم خدیجہ و عائشہ کے ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہو گی؟"

بخاری کی باتیں

شیخ حسام الدین مرحوم

ہم سے دیوانوں کی اے اہلِ جہاں قدر کرو
ہم سے دیوانوں کے تاریخ میں نام آتے ہیں

ہندوستان کے عوام میں احساس آزادی کی لو بھڑک رہی تھی۔ اور دوسری جانب انگریز ہندوستان پر اپنی گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حصولِ آزادی کی ہر تحریک ہر مکتب خیال کے لوگوں کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی تھی، خاص طور پر ملک کا نوجوان طبقہ تو ان تحریکوں کے اثرات قبول کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہا کرتا تھا۔

سیاسی بیداری کے اس موسم میں بیشتر مقرروں اور گھاگ قسم کے واعظوں نے اپنی دکانیں خوب چمکا رکھی تھیں۔ اس طائفے کے بہت سے لوگ دراصل اقتدار کے ہاتھوں میں کھلونے بنے ہوئے تھے۔ اور اپنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد تک کو قربان کرنے سے نہیں چوکتے تھے غرضیکہ دین اور سیاست کے نام پر مختلف حلقوں میں عجیبُ النّوع تاویلیں اور تفسیریں ہوا کرتیں تھیں۔

مجھے سیاسی اونچ نیچ کا کچھ شعور نہیں تھا۔۔۔۔ تاہم حالات نے ایک ایسے اضطراب سے ضرور آشنا کر دیا تھا۔ جسے آگے چل کر نصب العین کی اساس بننا تھا۔

۱۹۱۸ء میں مہاتما گاندھی نے رولٹ بل کے خلاف تحریک کا آغاز کیا، انگریزوں کی بدعہدی کے خلاف ملک کے گوشے گوشے میں احتجاج کا آغاز ہوا۔۔۔۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہڑتالوں اور جلوسوں کی صورت میں احتجاج کا غلغلہ بلند کیا۔ میں ان دنوں خالصہ کالج امرتسر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اتحاد باہمی کا یہ عالم تھا کہ ہندوؤں تک نے مساجد میں تقریریں کیں۔ اور آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں انقلاب انگیز قدم اٹھایا۔

شاہ جی جس متانت، سنجیدگی، استدلال اور منطق کو پیرایۂ اظہار میں لاتے وہ انہیں کا حصہ تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہی دنوں حالات کے اُفق پر حضرت سید عطا اللہ شاہ بخاری کی شخصیت اُبھری۔۔۔ اور نکھرتی چلی گئی۔ ان دنوں میں نے شاہ جی کو محلہ دار مجالس میں سنا تو ان کے دین و دانش کی کشش نے مجھے انکا گرویدہ بنا دیا۔۔۔۔ اس دور کے مناظروں میں اشتعال انگیز گفتگو اور حزب مخالف پر سب و شتم کو مناظرے کا ایک حصہ شمار کیا جاتا تھا، لیکن شاہ جی جس متانت، سنجیدگی، استدلال اور منطق کو پیرایۂ اظہار میں لاتے تھے، وہ

انہیں کا حصہ تھا۔ اور دین مذہب کے معاملے میں ان کے علم کی وسعتوں کا آج بھی خیال آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا کیا خوبیاں اور کیسے کیسے کمالات تھے جن سے فطرت نے بخاری کی شخصیّت کو آراستہ کیا تھا۔

ذہنی طور پر تو میں شاہ صاحب کے خیالات کی

مرزا بشیرالدین محمود کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

گرفت میں آ ہی چکا تھا۔ لیکن عملی طور پر ابھی تک ان قرب کی سعادت مجھے نصیب نہ ہوئی تھی کہ غالباً۔ ۱۹۲۰ء میں قادیانیت کی لہر ایک نئی کروٹ کے ساتھ حالات پر اثر انداز ہونے لگی۔ امرتسر کے بندے ماترم ہال میں ایک جلسے کا اہتمام ہوا جس میں مرزا بشیر الدین محمود کو شریک ہونا تھا چنانچہ پولیس کا انتظام بھی بے حد وسیع تھا۔۔۔۔ لوگ بھی بڑی تعداد میں جمع تھے۔۔۔۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔۔۔۔ لیکن مرزا بشیر الدین محمود کے لئے چائے کا انتظام تھا۔ وہ سٹیج کی اوٹ میں چائے نوشی کا لطف اٹھانے لگے، اُن کی اس حرکت سے لوگوں میں بڑی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ بلکہ ان میں ایک نفرت سی اُبھرنے لگی۔ خیر اجلاس کا آغاز ہوا، مرزا صاحب میر محفل بنے بیٹھے تھے، ایک مبلغ روشن دین نے تلاوت قرآن شروع کی۔

اچانک پچھلی صفوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوا۔۔۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری صفیں چیرتے ہوئے دیوانہ وار اسٹیج کی جانب لپک رہے تھے۔ انکے چہرے پر جلال کی یہ کیفیت تھی کہ لوگ از خود ان کے لئے راستہ بناتے گئے۔ جب وہ اسٹیج سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ تو ان کی آواز کا شعلہ فضا میں لپکا اور یہ الفاظ گونجنے لگے۔

"ٹھہرو! تم قرآن پاک کی غلط تلاوت کر رہے ہو۔۔۔ خدا کے خوف سے ڈرو۔"

مرزا بشیر الدین محمود کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اتنے میں پولیس اسٹیج کے قریب آ گئی اور مرزا صاحب کو گھیرے میں لے لیا۔۔۔۔ لوگوں میں ایک افراتفری سی پھیل گئی۔ نعرہ ہائے تکبیر گونجنے لگے اور آن کی آن میں تمام جلسہ تتر بتر ہو گیا۔

شاہ صاحب کی یہ جرأت ان کے جذبہ ایمان کی ایک ایسی روشن اور واضح دلیل ہے کہ اس کے بعد اس پہلو پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے واقعات کو معرض تحریر میں لانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

امرتسر میں جب جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا۔۔۔ تو انگریزوں نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس دور میں مارشل لاء کے نفاذ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی لگن کچھ اور بڑھ گئی۔ اور اندر ہی اندر ایک حرارت انگریزوں کے خلاف ایک نفرت کی شکل اختیار کرتی گئی۔ آخر ستر دن کے بعد مارشل لاء ختم ہوا۔۔ تو راہنماؤں نے انگریز کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور اس شدت سے مصروف عمل ہوئے کہ جلیانوالہ باغ میں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے اور پھر مارشل لاء کی قدغن لگانے والے لفٹیننٹ جنرل گورنر سر مائیکل اڈ وائر کو رخصت ہونا پڑا۔

برطانوی استبداد کے یہ تماشے، شاہ جی کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت کا ایک ایسا بیج بوتے رہے کہ وہ زندگی کے آخری ایام میں بھی یہ کہا کرتے کہ۔

"انگریز کی فطرت کا خمیر سانپ کے زہر سے اٹھایا گیا ہے۔ اور اپنی غذا کے لئے اسے انسانی خون کی جو چاٹ پڑی ہے مشکل سے چھوٹے گی۔"

مذکورہ مارشل لاء کے بعد ہندو مسلم اتحاد نے نئے خطوط وضع کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں منعقدہ ہوا۔۔۔ جس میں علی برادران، ڈاکٹر کچلو، مسز سروجنی نائیڈو مفتی کفایت اللہ،

مجھے برسوں تک شاہ جی کی رفاقت کا فخر حاصل رہا۔

علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر انصاری اور دیگر بہت سے راہنمایان وطن جمع ہوئے۔ اس اجلاس میں عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اسٹیج کے ایک کنارے ہمہ تن گوش بیٹھے تھے ان دنوں گو شاہ جی کا دائرہ عمل دینی تبلیغ کی حدود سے باہر نہیں تھا۔۔۔ لیکن ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ان پر سیاسی رنگ چڑھ رہا تھا۔۔۔ اور وقت کو جو عظیم خدمت شاہ جی سے مقصود تھی۔۔۔ حالات انہیں اس کے لئے از خود تیار کر رہے تھے، بلکہ دین اور سیاست کی ہم آہنگی کا تصور انکے دل میں جوان ہو رہا تھا۔

چنانچہ خلافت کانفرنس کے عہد میں مولانا داؤد غزنوی کی وساطت سے شاہ جی نے سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا۔۔۔ میں بھی ان دنوں عملی طور پر سیاسیات سے وابستگی اختیار کر چکا تھا۔

بلکہ اس جگہ اس امر کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ مجھے سیاست کے میدان میں لانے کے لئے ہر چند کہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کا بڑا ہاتھ تھا۔۔۔ لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت کی کشش بھی دراصل اس کی بنیاد تھی۔

مجھے برسوں تک شاہ جی کی رفاقت کا فخر حاصل رہا ہے۔ میں ہمیشہ اُن کی شخصیت کا بڑے غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ اور ہر مرتبہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان جیسا بیدار مغز، صاحب ایمان، عالم دین خطیب خوش گفتار اور اسلام کا شیدائی پھر پیدا نہیں ہو سکتا۔

ان کی عالی ظرفی کا اندازہ کیجئے کہ میرا کئی مرتبہ سیاسی مسائل پر ان سے اختلاف بھی ہوا، بات کے مختلف پہلوؤں پر گرما گرم بحثیں بھی ہوئیں مگر۔۔۔۔ اس قسم کے حالات ساون کے بادلوں کی طرح گزر گئے، شاہ جی کے مزاج اور میرے ساتھ برتاؤ میں کبھی فرق نہ آیا۔۔۔ وہ اپنے طرز

انتخاب ووٹوں کی اساس پر نہ کیا کرو، بلکہ مسائل اور ضروریات کی روشنی میں ذمہ داریاں سنبھال لیا کرو

عمل سے ایک مجھی کو کیا، بلکہ ہر دوست دشمن کو اپنا گرویدہ بنا لینے کا کچھ ایسا ڈھنگ جانتے تھے کہ۔۔۔۔ اس دور کے لوگوں میں وہ بالکل ناپید ہے۔۔۔ بلکہ آئندہ بھی اس قسم کی صفات کی جھلک کسی انسان میں مشکل سے دیکھنے میں آئیں گی۔

مجلس میں انتخابات کے موقعہ پر وہ کہا کرتے تھے کہ۔

"بھائی! انتخاب ووٹوں کی اساس پر نہ کیا کرو۔ بلکہ مسائل اور ضروریات کی روشنی میں ذمہ داریاں سنبھال کر کیا کرو۔"

چنانچہ مجلس احرار کے رہنمائے میں انہوں نے احرار زعما کے اندر ایک ایسی روح پھونک دی تھی کہ وہ کام اور خدمتِ قوم کی لگن میں جماعتی انتخابات کی سطح سے بلند

بالا رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔۔۔ چنانچہ اسی نظریئے کے تحت ۱۹۳۱ء میں مجھے مجلس احرار کا صدر بنایا گیا حالانکہ میں (جونیئر موسٹ) تھا لیکن وقت کی ضرورت کے پیش نظر ہم میں اختلافات کو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ میں مسلسل آٹھ برس تک صدر رہا۔ پھر جب پاکستان بنا تو ماسٹر تاج الدین انصاری نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

مجلس احرار کی صدارت کے زمانے میں شاہ جی نے ہمیشہ سیاسی، مذہبی، دینی اور ملی مسائل کو حل کرنے میں درپردہ میری ایسی رہنمائی کی۔۔۔ کہ ان کرم فرماؤں کے سلسلے میں شاہ جی کی روح کو میں جس قدر بھی خراج تحسین ادا کروں کم ہے۔

میں نے شاہ جی کے ساتھ اپنی سیاسی زندگی میں کئی مرتبہ قید و بند کے مراحل بھی طے کئے۔ لاہور پنڈی، اور ملتان کی جیلوں میں بہت سے لیل و نہار ہم نے ایک ساتھ بسر کئے۔۔۔ جیل کی دنیا میں بھی میں نے شاہ جی کے مزاج کی اُن خوبیوں کو پژمردہ نہیں دیکھا جو ان کی شخصیت کا ایک حصہ تھیں۔ تکالیف پر مسکراہٹیں نچھاور کرنا تو گویا ان کا ایک مشغلہ بن گیا تھا۔ اور بے خوف اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے نتائج کی پروا کئے بغیر ہر مقام پر اور ماحول میں دشمنوں سے ٹکرانے کے لئے ہر وقت تیار رہا کرتے تھے۔۔ اور خاص طور پر عشق رسول ﷺ کے معاملے میں تو ان کے جذبات کی مثال اس دنیا میں ملنا ہی ناممکن ہے۔

وہ جانتے تھے کہ شاہ جی کی تقریر کی حدود تو سپیدۂ سحر سے جا ملتی ہیں

اعتراف

"جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں متاثر کیا۔ اُن میں عطاء اللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دل فریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے اُن مقدس راہبوں کی طرح تھا۔ جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہ ہوتی ہیں یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنہیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ لیکن ان کے صحیح شناسا ہمارے ہاں کے ہیں؟ میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا۔ لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں۔ میں تو اس کی زبان کچھ نہ کچھ سمجھ ہی لیتا تھا لیکن وہ انگریزی سے قطعاً ناواقف تھا۔ اس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء کے اس "اینٹی برٹش" ذہن کی باقیات میں سے تھا جنہیں ہمارے پیشروؤں نے علماء کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا"

ہندوستان کی یادیں: (مصنف۔ کرنل ھاڈر سابق سپرنٹنڈنٹ جیل راولپنڈی۔

اپنوں پرائیوں میں میں نے شاہ جی کا جو احترام دیکھا، اس کے پیش نظر کہہ سکتا ہوں کہ اگر سیاست کی وادیوں میں قدم نہ بھی رکھتے تو پیری مریدی کے میدان میں وہ بڑی شاہانہ زندگی بسر کر سکتے تھے اور دنیاوی آسائشیں اور راحتیں ان کا اوڑھنا بچھونا بن سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے فقر و درویشی کا ایسا شعار اختیار کیا جس پر دنیاوی تکلیفوں کے باوجود وہ زندگی بھر فخر کرتے رہے۔

شاہ جی کی شخصیّت کو اللہ تعالیٰ نے جہاں اور بے شمار صفات سے متصف کیا تھا وہاں ایک صاف ستھرے علمی و ادبی ذوق سے بھی ان کے مزاج کی آراستگی کی تھی۔

نہ صرف وہ جملوں کی پیوستگی کو خوب سمجھتے تھے، بلکہ اشعار کی برجستگی سے بھی کماحقہ آشنا تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ خود شاہ جی نے مجھے سنایا تھا کہ سائمن کمشن کے سلسلے میں الہ آباد میں ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا۔ پنڈت موتی لعل نہرو نے شاہ جی کو اس اجلاس میں شرکت کے لئے بہ طور خاص بلوایا اور اپنے ہاں ٹھہرایا۔۔۔ رات کو جلسے میں بڑے بڑے راہنماؤں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ پنڈت موتی لعل نہرو نے سب مقررین کو اس لئے پہلے وقت دیا کہ وہ جانتے تھے کہ شاہ جی کی تقریر کی حدود تو سپیدۂ سحر سے جا ملتی ہیں، اس لئے جب سب مقرر بول چکے تو شاہ جی کا نام پکارا گیا۔۔۔ اتنے میں سائمن کمشن کے خلاف ایک احتجاجی جلوس بھی جلسہ گاہ میں آ گیا۔ لوگوں نے "سائمن کمشن" کی ارتھی کندھوں پر اٹھا رکھی تھی۔ جسے دیکھتے ہی شاہ جی کو تقریر کا سر آغاز ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کیا۔۔۔ اور ارتھی کی طرف اشارہ کر کے اپنے مخصوص لب ولہجے میں بولے

ہوئے تم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا ۔۔۔۔۔۔۔ نہ کہیں مزار ہوتا

ادھر الفاظ شاہ جی کے ہونٹوں سے جدا ہوئے ادھر موتی لعل نہرو کرسیٔ صدارت سے اچھل پڑے اور سامعین میں بھی بخاری زندہ باد! کا غلغلہ بلند ہونے لگا۔ بس پھر کیا تھا، اسی شعر کی اساس پر انہوں نے خطابت کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ مجمع لوٹ پوٹ گیا۔ غالب کے اس ایک ہی شعر نے وہ رنگ دکھایا، کہ ایک نہایت مشکل مضمون کی باریکیاں حاضرین پر واضح ہو گئیں۔ وہ سائمن کمشن کے بارے میں شاہ جی کے خیالات کو چند ہی لفظوں میں پوری طرح سمجھ گئے۔ وہ اپنی تقریر کے کسی ایسے موڑ پر برجستہ شعر استعمال کیا کرتے، کہ محسوس ہوتا جیسے شعر اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ انہیں اردو، فارسی عربی اور پنجابی کے ان گنت اشعار ازبر تھے، خطابت میں زبان اتنی فصیح و بلیغ ہوا کرتی کہ نثر پر بھی شاعری کا گمان ہوتا۔

بذلہ سنج اور خوش گفتار ایسے کہ محض الفاظ کی اُلٹ پُلٹ سے گفتگو میں طنز و مزاح کے تیور اور نشتریت کا اثر پیدا کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

شاہ جی بعض اوقات بڑے بڑے علمی و دینی مسائل کی گرہیں کھولتے ہوئے شعر و شاعری سے ایسا کام لیا کرتے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی۔

مثلاً ایک مرتبہ حج کے بارے میں تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ اچانک مزاج کا رخ شعر و سخن کی طرف گیا۔ کہنے لگے۔

کوئی تو بات ہے ساقی کہ میکدے میں ضرور
جو دور دور سے میخوار آ کے پیتے ہیں
بہ فیض میکدہ دیکھو کہ چار ہی دن میں
ہم ایسے رند بھی پینا بتا کے پیتے ہیں

شاد عظیم آبادی کے یہ اشعار شاہ جی کے نفیس لب و لہجہ میں سن کر حاضرین بے ساختہ جھوم اٹھے۔

میں نے شاہ جی کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں اور خطیبوں کا چراغ گل ہوتے دیکھا ہے۔ ایک جلسے میں شاہ

جی کے علاوہ مولانا محمد علی اور دیگر زعما نے بھی تقریریں کیں۔ لیکن شاہ جی کی تقریر کا رنگ و روغن ہی کچھ ایسا تھا۔ ان کے بعد اس فن کے بعض نامی گرامی لوگوں کی تقریر بھی عوام کو متاثر نہ کر سکی۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے شاہ جی سے کہا۔

"بخاری! تم اپنی تقریر میں لوگوں کو جب قورمہ اور پلاؤ فراہم کرتے ہو تو بعد میں انہیں یہ بھی کہہ دیا کرو۔۔۔ کہ محمد علی کی سوکھی روٹی بھی قبول کر لیا کریں۔

اس پر شاہ جی فوراً بولے۔

"حضور! ایک جرنیل ایک سپاہی کے بارے میں یہ بات کہہ رہا ہے! سپاہی کی شہرت تو دراصل جرنیل کی عظمت کا آئینہ ہوتی ہے۔"

یہ الفاظ سن کر مولانا محمد علی نے مزید بحث و تمحیص کی گنجائش نہ پاتے ہوئے یکسر چپ سادھ لی۔

بخاری جیسے خطیب کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا محمد علی جیسے جادو بیان مقرر نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں شاہ جی کے بارے میں نہایت جلی طور پر لکھا تھا کہ:۔

"یہ شخص مقرر نہیں بلکہ ساحر ہے"

شاہ جی کے بارے میں میرے دل میں ان گنت یادوں کا ایک ایسا بے ترتیب سرمایہ موجود ہے جسے مربوط کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیے۔۔۔ وہ ایک ایسی یگانۂ روزگار ہستی تھے کہ ان کا تذکرہ برسوں میں بھی ختم نہیں ہو سکتا۔۔۔ آخر میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

بہ شکریہ ہفت روزہ چٹان لاہور۔ ۱۹۶۲ء





واہ وآہ

قید و بند

میری زندگی ہی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی، ایک چوتھائی جیل میں جتنے دنوں باہر رہا۔ لوگ گلے کا ہار بنتے گئے آج کلکتہ کل ڈھاکہ، ڈھاکہ سے لکھنؤ، لکھنؤ سے بمبئی، پھر آگرہ، آگرہ سے دہلی، دہلی سے لاہور، لاہور سے پشاور، پشاور سے کراچی، ذرا ہندوستان کے دیہات اور قصبات کا اندازہ کر لو، ہر کہیں گھوما پھرا ہوں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں کی ہوں گی۔

دن کہیں، صبح کہیں، شام کہیں، رات کہیں

میں نے تقریر کی، لوگوں نے کہا، "واہ شاہ جی واہ" میں قید ہو گیا، لوگوں نے کہا۔ "آہ شاہ جی آہ" اور واہ و آہ میں ہم ہو گئے تباہ۔۔۔!"

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

میرے مرشد، میرے لیڈر، میرے ہمدم، میرے دوست

"شاہ جی"

ماسٹر تاج الدین انصاری مرحوم

پروردگار عالم نے ابن آدم کو عجیب عجیب نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ یہ مشت خاک مجموعہ کمالات ہے۔ غور فرمایئے کہ انسان حافظے کی کمندیں ڈال کر اپنے ماضی کو کس آسانی سے حال کی جانب کھینچ لاتا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے کے گزرے ہوئے واقعات آنِ واحد میں اس طرح سامنے آجاتے ہیں گویا ابھی ابھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے آج سے تقریباً چالیس سال قبل جب میں روزانہ زمیندار کا مطالعہ کرتا تو ترکوں پر برطانیہ کے مظالم پڑھ کر مجھے دکھ ہوتا تھا۔ پھر رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا تھا کہ اسی برطانیہ نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے اور اسی کے ہاتھوں آج ترکوں کی تباہی اور بے آبروئی ہو رہی ہے۔ پھر سوچتا کہ ہم بالکل بے بس ہیں اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ایک دن مایوسی ناامیدی اور بے کسی کے خیالات میں گھرا ہوا گھر سے تھوڑی دور باہر چوک پر پہنچا تو میرے بچپن کے دوست میر محمد فیضی مجھے ملے۔ علیک سلیک کے بعد میر فیضی نے بتایا کہ وہ امرتسر سے آرہے ہیں وہاں گزشتہ رات ایک جلسۂ عام تھا۔ اس میں ایک نوجوان مولوی نے ایسی پیاری تقریر کی سبحان اللہ سبحان اللہ ایمان تازہ ہو گیا۔ پوچھا کیا نام تھا مولوی کا؟ میر فیضی نے جواب دیا۔ "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" پھر کہنے لگے مولوی کیا ہے فرشتہ ہے سید زادہ بڑا ہی خوبصورت نوجوان ہے۔ اللہ نے لحنِ داؤدی عطاء فرمایا ہے۔ قرآن پڑھتا ہے تو سامعین پر وجد طاری ہوتا ہے بولتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں تقریر ایسی دل پذیر کہ دلوں میں اتر جاتی ہے مجھے تو اب تک نشہ ہے امرتسر سے مسرور ہو کر آیا ہوں۔" اس ظالم نے بخاری کی باتیں سنا سنا کر مجھے ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کیا جہاں طبیعتیں نیا راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے دوست سے حضرت شاہ صاحب کی تعریف سن کر سوچنے لگا کہ ایسی تقریر تو ضرور سننا چاہیے۔ میں امرتسر پہنچوں یا انہیں لدھیانے بلاؤں چنانچہ میر فیضی سے مشورہ کے بعد طے ہوا کہ شاہ صاحب کو لدھیانے بلا کر جلسۂ عام کیا جائے۔ جلسہ کیسے ہو گا۔ انتظام کون کرے گا جلسہ کس جگہ کیا جائے، جوانی کے جوش نے کچھ سوچنے سمجھنے نہ دیا۔ دوسرے دن میری فیضی کو امرتسر روانہ کر دیا اور تاکید کر دی کہ شاہ صاحب لدھیانے تشریف لانے کے لئے آمادہ ہو

میں نے معزز مہمان کو غور سے دیکھا، بھرپور جوانی کی خوبصورت آنکھوں میں مستی کے بجائے حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی

جائیں تو مجھے تار کے ذریعے اطلاع کر دی جائے۔

میری فیضی بڑے ذہین اور جوشیلے نوجوان تھے وہ امرتسر پہنچے اور شاہ صاحب سے دوسرے دن لدھیانے آنے کا وعدہ لے کر واپس آ گئے پہلے جلسے کا اعلان بھی ہم نے خودی ہی کیا گیس کے ہنڈے۔ فرش اور ٹھنڈے پانی کا بندوبست غرضیکہ جلسے کے لوازات اور انتظامات سے فارغ ہو کر ہم نے دوستوں کو ہمراہ لیا اور شاہ صاحب کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے گاڑی لدھیانہ اسٹیشن پر آ کر رکی۔ میں تو شاہ صاحب کو پہچانتا نہ تھا، فیضی نے انہیں دیکھا ہم سب لپک کر ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے۔ سڈول جسم کا خوبصورت نوجوان جس کی پیشانی شرافت نجابت اور شجاعت کا پتہ دے رہی تھی نہایت سادہ لباس میں گاڑی سے مسکراتا ہوا پلیٹ فارم پر اُترا۔ میں نے معزز مہمان کو غور سے دیکھا بھرپور جوانی کی خوبصورت آنکھوں میں مستی کی بجائے حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تھے بخاری جن سے میر فیضی نے میرا تعارف کرایا۔ بخاری خراماں خراماں دوستوں عقید تمندوں اور اجنبیوں کے جھرمٹ میں ریلوے اسٹیشن سے باہر تشریف لائے۔ ہم انہیں گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر میر فیضی کے مکان پر لے گئے۔ انہیں کمرے میں بٹھا کر میں نے اپنے دوست سے کہا فیضی میرے دل پر سید زادے کو دیکھ کر اتنا اثر ہوا ہے کہ تقریر سنوں گا تو کیا ہو گا؟ فیضی نے ہنس کر کہا جلسے کے بعد دیکھنا کیا ہوتا ہے ہم نے شاہ صاحب کو کھانا کھلایا اور عشاء کی نماز کے لیے سامنے والی مسجد میں چلے آئے اور نماز سے فارغ ہو کر جلسے گاہ کی طرف چل دیئے!

خلوص میں کتنی برکت ہے۔ ہمارے ساتھ کون تھا ہم نوجوانوں کی حیثیت ہی کیا تھی مگر لدھیانے میں پہلا جلسہ اس ٹھاٹھ کا ہوا کہ دریا کے کنارے کا بہت وسیع میدان ہندو اور مسلمانوں سے کھچا کھچ بھر گیا لوگوں کے دلوں میں نیا نیا شوق اور جوش تھا وہ بخاری کی تقریر سننے کے لیے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ جلسہ شروع ہوا۔ بخاری نے خطبہ مسنونہ پڑھا قرآن پاک کی تلاوت شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے آیات ابھی ابھی نازل ہو رہی ہیں مجمع پر سکوت طاری تھا قرآن پاک کی تلاوت دل کی آلودگیوں کو صاف کر کے نور ایمان سے جگمگا رہی تھی سامعین پر وجد طاری تھا جلسہ گاہ میں مکمل سکوت تھا جب بخاری نے بولنا شروع کیا تو گویا لالہ زار کھل گیا۔ اور جب

> **تقریر بخاری نے کی مگر اپنے شہر میں ہمیں عقیدت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ یعنی لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگا**

اپنے خاص انداز اور ترنم سے برمحل شعر پڑھتے تو سامعین پھڑک اٹھتے۔ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کی صدائیں بلند ہوتیں۔ تکبیر کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی۔ رات کے ایک بجے تک جلسہ رہا بخاری نے اپنی پہلی تقریر ہی سے اپنی دھاک بٹھا دی۔ تحریک کے لیے میدان ہموار ہو گیا۔ تقریر بخاری نے کی۔ مگر اپنے شہر میں ہمیں عقیدت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ یعنی لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگا۔ ہزار ہا لوگوں کی زبانوں پر بخاری کا قصیدہ تھا۔ میرے ساتھیوں اور ہاتھ بٹانے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ بہادر اور مخلص نوجوان میرے گرد جمع ہو گئے۔ شہر والوں نے پھر تقاضا کیا کہ بلاؤ بخاری کو۔ ہم

نے دوبارہ درخواست کی جسے بخاری نے قبول فرما لیا۔

بخاری کی بار بار تشریف آوری سے ہمارے ہاں کے اکثر نوجوان صحیح رنگ میں رنگے جا چکے تو ایک روز جلسے کے اختتام پر وہ مجھے الگ لے گئے اور فرمانے لگے کہ لدھیانہ تو علماء کا زبردست تاریخی مرکز ہے۔ یہ دوسرا دیو بند ہے۔ تم مولوی حبیب الرحمان کو جانتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے عرض کیا کہ ہم تو ایک ہی محلے کے رہنے والے ہیں بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔ بخاری نے فرمایا کہ پھر مجھے کیوں بلاتے ہو وہ تو بڑی

بخاری کی محبت بھری ملاقاتوں نے میری زندگی کو یکسر بدل ڈالا

خوبیوں کے مولوی ہیں خاندانی وجاہت کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے مقرر ہیں ان کا خاندان تو انگریز دشمنی میں نمبر ایک پر شمار ہوتا ہے۔ تم ان سے ملو۔ اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ تم ہر ہفتے مجھے بلا لیتے ہو۔ مجھے امرتسر اور لاہور میں کام کرنے دو۔ مگر مجھے چونکہ بخاری سے بے پناہ عقیدت اور غایت درجہ کی محبت تھی، میری درخواست پر وہ لدھیانے آ ہی جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے سیاسی میدان میں کھینچ کر لانے اور غلامی سے نفرت اور بیزاری پیدا کرنے میں انہی کا ہاتھ ہے ورنہ میں تو قطعی دنیا دار اور کھلنڈرا

واہ بھئی واہ تین خداؤں کو ماننے والی حکومت نے سزا بھی تین سال ہی کی دی

نوجوان تھا۔ شکار سے فرصت ملی تھی کرکٹ کھیل کر دن ضائع کر دیا۔ بخاری کی محبت بھری ملاقاتوں نے میری زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ آزادیٔ وطن کے لیے قربانی کا جذبہ بخاریؒ نے میرے دل میں اسطرح کوٹ کوٹ کر بھر دیا کہ مجھے حال کے دریچے سے ماضی کو جھانکنے ہی کی فرصت نہ ملی۔ جیل سے جس کے تصور سے دل کانپ اٹھتا تھا کوچۂ محبوب بن گیا۔

۱۹۱۹ء میں جب بخاری نے خداداد قابلیت اور آتش بیانی سے برطانوی سامراج کا انجر پنجر ڈھیلا کرنا شروع کیا تو فرنگی نے کان کھڑے کیے اور بھانپ لیا کہ

بجنور کے اُفق پر

۱۹۴۶ء میں یوپی احرار کانفرنس کا اجلاس بجنور میں ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے اجلاس شبینہ میں قرآن پڑھنا شروع کیا تو ایک گھنٹہ تک قرآن ہی پڑھتے چلے گئے۔ مجال ہے کہ ایک آدمی بھی مجمع سے ہلا ہو۔ تمام لوگ ہاتھ کی لکیروں کی طرح جمے بیٹھے تھے۔ ادھر وہ قرآن سنا رہے تھے۔ ادھر یہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ اور صفا و مروہ کی پہاڑیوں میں گونجی ہوئی سورتیں بجنور کے افق سے اتر رہی ہیں------!

اس جادو بیاں نوجوان کو آہنی پنجے سے دبوچ نہ لیا تو یہ دل جلا ہر ہندوستانی کے دل میں ایسی آگ سلگائے گا جس پر قابو پانا محال ہو جائے گا چنانچہ کسی ایک تقریر کی بنا پر

میرے دل میں ایک جذبہ کارفرما تھا میں یہ سمجھتا تھا کہ پکڑا جاؤنگا تو بخاری کے پاس پہنچا دیا جاؤنگا

حضرت شاہ صاحب کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ مجسٹریٹ نے جب بخاری کو تین سال قید سخت کا حکم سنایا تو بخاری نے فقرہ چست کرتے ہوئے فرمایا

"واہ بھئی واہ تین خداؤں کو ماننے والی حکومت نے سزا بھی تین سال ہی کی دی۔"

بخاری کو امرتسر سے لاہور اور لاہور سے میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا۔ میرے ایسے ہزاروں عقیدتمندوں نے بخاری کی جدائی کو سختی سے محسوس کیا۔ دل بے تاب ہونے لگے۔ سلگنے والی آگ بھڑکنے لگی۔ میں اس وقت "گونگا مجاہد" تھا۔ فنّ تقریر سے قطعی نا آشنا۔ جیل جانے کے لیے بے تاب تھا مگر اندر جانے کا کوئی طریقہ کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کے رہنما سول نافرمانی کی راہیں تلاش کر رہے تھے مگر ان کو بھی مناسب طریقہ اور صحیح راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اس مشکل کو برطانوی کارندوں نے آسان کر دیا چنانچہ حکومت کی جانب سے لاامنڈمنٹ ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ میں بھاگوں چھینکا ٹوٹا میں دوڑا دوڑا لاہور پہنچا تو صوبائی رہنماؤں کی مجلس مشاورت ہو رہی تھی۔

مجھے بخاری کی یاد نے تڑپا رکھا تھا۔ میں نے رہنماؤں کے سامنے استدعا کی اور آٹھ سو رضا کاروں کے حلف نامے پیش کرتے ہوئے سول نافرمانی کی اجازت حاصل کر لی۔ گھر پہنچا شہر میں اعلان کیا بہت بڑا جلوس نکلا اور میں گرفتار ہو گیا۔ میری خوش قسمتی ملاحظہ فرمائیے کہ میں لاامنڈمنٹ ایکٹ کا پہلا قیدی تھا۔ اور اس فخر کے حاصل کرنے میں بھی بخاری کی مہربانیوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔

میں جب گرفتار ہونے کے لئے زیادہ بے تاب تھا تو میرے دل میں ایک جذبہ کارفرما تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ پکڑا جاؤں گا تو بخاری کے پاس پہنچا دیا جاؤں گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا مہینہ بھر میرا دل کروٹیں لیتا رہا بالآخر قدرت نے یہ آرزو بھی پوری کر دی۔ لدھیانے سے انبالہ اور انبالہ سے میانوالی جیل پہنچ گیا۔ دیکھا زندگی میں میل ملاپ کی کس قدر کشادہ راہیں موجود ہیں مگر اب ۔۔۔۔۔ ع

"ہم کہاں بیٹھ کے اب نالہ و فریاد کریں"

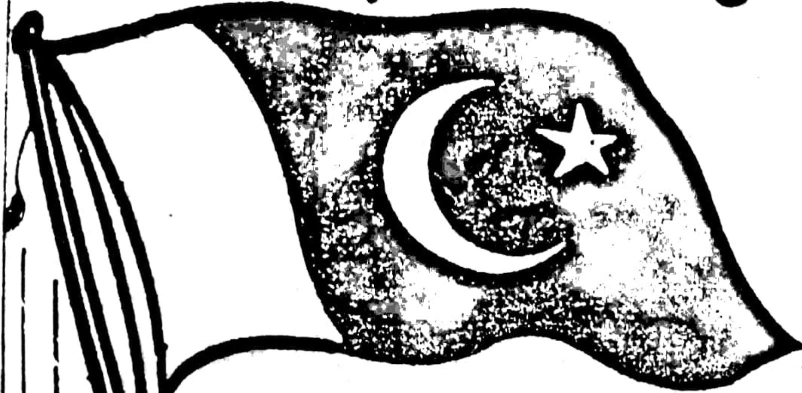
حضرت شاہ صاحب اپنے خدا کے پاس وہاں پہنچ گئے جہاں بلاوے کے بغیر کوئی جا بھی نہیں سکتا اور جو چلا جائے وہ واپس نہیں آتا۔

اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر"

بہ شکریہ ہفت روزہ چٹان لاہور ۱۹۶۲ء

ایک دفعہ آپ کے ایک ارادت مند دوست راشن کارڈ کا فارم لے آئے اور آمدنی کی بابت پوچھا تو مسکرا کر فرمایا۔ کبھی دھن دھنا کبھی مٹی بنا کبھی یہ بھی نہیں۔

"پاکستان میرا وطن ہے"





۱۹۵۲ء میں جب پنڈت نہرو نے پاکستان کی سرحد پر بھارتی فوجوں کا زبردست اجتماع کر دیا تو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں احرار کی جنگی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"پاکستان میرا وطن ہے، میں اس کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت کے لئے دشمنان پاکستان کے خلاف لڑوں گا۔ پاکستان کی حفاظت میرا ایمان ہے اس کی حفاظت کے لئے سب سے پہلی قربانی عطاء اللہ شاہ پیش کرے گا۔ لیاقت علی سے ہمارے ہزار اختلاف ہوں لیکن وطن کی حفاظت کے لئے ہم سب اس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔"



پٹنہ میں جنم لینے والی عظیم شخصیت اور میرے بھائی سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی

کچھ یادیں ۔ کچھ باتیں

سید بدرالدین احمد عظیم آبادی مرحوم۔ بی اے ایل ایل بی۔ سابق صوبائی سیکریٹری جنرل آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۷ء

کراچی سے سید محمود احمد عظیم آبادی، برادر اصغر سید بدرالدین احمد مرحوم کا تحفہ الاحرار کی اشاعت خاص کے لئے

غالباً ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ ایک بزرگ تجارت کے سلسلہ میں صوبہ پنجاب کے ضلع گجرات سے پٹنہ آئے۔ یہ ضلع گجرات کے ایک باعظمت خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو سیادت و وجاہت اور سلسلۂ بیعت کے لئے مشہور تھا۔ یہ خود بھی بہت ہی متدین اور متشرع اخلاق وعادات میں بہت ہی منکسر المزاج اور ملنسار تھے۔ محلہ جھاؤ گنج میں جو خواجہ عنبر کی مسجد ہے اُسی کے حواشی مکانوں سے ایک میں ٹھہرے۔ اُن کی تجارت کاشمیری شال اور جامہ وار کے علاوہ مشک و زعفران کی تھی۔ جلد ہی انکی وجاہت، پیشہ میں ایمانداری اور اعلیٰ درجے کی چیزوں کی بکری کے باعث انکی رسائی پٹنہ کے بڑے بڑے گھروں میں ہونے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے خواجہ عنبر کی مسجد کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور اس میں جا رہے اور دو چار برس بعد اپنے بچوں اور ایک بھتیجے کو بھی پنجاب سے لے آئے۔ جو ان کی نگرانی میں مکتب اور اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے بھتیجے سید شاہ ضیاء الدین تھے جو حافظ قرآن بھی تھے۔ اور وہ تجارت میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ اور اپنے چچا ہی کی طرح بڑے متدین اور متشرع بھی تھے۔ دونوں چچا بھتیجا ساتھ ہی رہتے تھے، کبھی مال کی بکری میں ساتھ جاتے اور کبھی الگ الگ، پنجاب سے جو اشخاص آتے وہ ان دونوں سے ملنے کو ضرور ان کے پاس جاتے آس پاس کے سکھ حضرات بھی ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے۔

انہی دنوں محلہ خانہ باغ پٹنہ میں ایک بزرگ رئیس سید احمد شاہ رہتے تھے۔ ان کا مکان بھی خانہ باغ کہلاتا تھا اور اسی مکان کے نام پر یہ محلہ بھی خانہ باغ کہلانے لگا۔ سید احمد شاہ صاحب نجیب الطرفین سید تھے۔ اور انکو تلاش تھی کہ کوئی اعلیٰ خاندان کا لڑکا مل جائے تو اپنی صاحبزادی کی اس سے شادی کر دیں۔ جب سید شاہ ضیاء الدین صاحب اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں پٹنہ آئے تو ان کو بہت جچے۔ انکے یہاں دونوں چچا بھتیجا کا آنا جانا بڑھا تو سید احمد شاہ نے حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب کو بہت زیادہ نزدیک سے دیکھا۔ لوگوں سے انکے خاندانی حالات معلوم ہو ہی چکے تھے۔ اب نسبت کا سلسلہ چلا تو بات پکی ہوتے دیر نہیں لگی۔ غرض سید شاہ ضیاء الدین سید احمد شاہ کے داماد بن گئے۔ کچھ دنوں کے بعد سید شاہ ضیاء الدین صاحب کی اہلیہ کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام تو سید شاہ شرف الدین رکھا گیا مگر حافظ سید شاہ ضیاء الدین اس کو عطاء اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہی نام آخر میں ان کا نام پڑ گیا۔ شاہ ضیاء الدین صاحب کے چچا آخر

عمر میں ضلع گجرات چلے گئے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹوں میں ایک صاحب پٹنہ میں ہی رہ گئے اور پولیس میں سب انسپکٹری کی ملازمت کرلی انکا نام سید محمد اسحاق تھا۔ کچھ دنوں کے بعد حافظ سید شاہ ضیاء الدین

والد مرحوم کی خواہش تھی کہ میری تعلیم و تربیت اور نگہداشت کا کام حافظ صاحب انجام دیں۔

صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت عطاء اللہ شاہ کمسن تھے مگر انکے والد صاحب نے خود ان کی دیکھ بھال شروع کی۔ اپنی اہلیہ کی زندگی میں بھی محلہ خانہ باغ کے قریب محلہ لنگور گلی میں ایک مکان خرید لیا تھا وہیں رہتے اور شال دو شالہ جامہ وار اور مشک و زعفران کی تجارت کرتے تھے۔ سال دو سال میں پنجاب بھی چلے جاتے۔ کچھ دنوں کے بعد سید شاہ ضیاء الدین صاحب نے دوسری شادی پنجاب میں کی مگر پٹنہ کو پھر بھی نہیں چھوڑا۔ اب سید عطاء اللہ شاہ عنفوان شباب کی سرحد میں پہنچ چکے تھے۔ اسی زمانے میں میرے والد مرحوم خان بہادر سید ضمیر الدین احمد صاحب نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے یہاں ان کے اجلاس کامل کے نائب صدر اور ان کے چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو کر جانے لگے تو یہ فکر ہوئی کہ میری دیکھ بھال کے لئے کوئی اچھا آدمی مل جائے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں سید شاہ ضیاء الدین صاحب تھے یہ والد مرحوم کے بڑے دوست بھی تھے، بڑے دیانتدار اور بڑے ہمدرد بھی۔ رہ رہ کر میرے والد مرحوم کی نظر انتخاب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب ہی پر ٹھہرتی تھی مگر ہچکچاتے تھے۔ کہ ان سے میری تعلیم اور نگہداشت صدر گلی میں رہ کر کرنے کی بات ان سے کہیں یا نہیں۔ آخر ایک دن جب حافظ صاحب مرحوم تشریف لائے تو والد مرحوم نے اپنی مشکل ان کے آگے پیش کی، جس میں یہ استدعاء بھی تھی کہ بھوپال جب والد مرحوم جائیں تو پٹنہ میں میری تعلیم و تربیت اور نگہداشت کا کام حافظ صاحب انجام دیں۔ حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ یہ بات منظور کرلی مگر شرط یہ رکھی کہ باورچی خانہ انکا اپنا رہے گا۔ جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب اس پر سختی سے مصر تھے۔ آخری انہی کی بات رہی۔ جناب حافظ صاحب کو والد مرحوم صرف میری تربیت تعلیم و نگہداشت کا کام نہیں سپرد کر گئے بلکہ گھر کا مختار کل بھی

میں نے دیکھا کہ یہ پڑھنے سے چھٹکارا پانے کی اچھی ترکیب ہے چنانچہ ایک دفعہ یہی داؤ میں نے بھی استعمال کیا۔

انکو بنا کر گئے۔ اب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب اپنے مکان لنگور گلی سے میرے مکان محلہ صدر گلی میں اٹھ آئے۔ ان کے صاحبزادے سید شاہ عطاء اللہ بھی ان ساتھ آگئے جن کو میں عطاء اللہ بھائی کہتا تھا۔ سید شاہ عطاء اللہ

کی عمر اس وقت اٹھارہ انیس سال کی ہو گی۔ یہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑے ہوں گے۔ انہوں نے بھی قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی کچے تھے۔ قرآن شریف کی تلاوت اور گردان میں بڑی تساہلی کرتے اور اس کے لئے جناب حافظ صاحب کی ڈانٹ بھی سنتے۔ سید شاہ عطاء اللہ نے ابتدائی عربی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ صدر گلی آئے تو ہمارا گھر بھرا ہوا ملا۔ ہم سبھوں کا مکان بہت بڑا تھا۔ ایک محلہ ہی کہیے۔ میرا مکان، میرے ماموں صاحبان کے مکانات زنانے اور مردانے حصے سب ایک ہی حلقہ میں تھے۔ سید شاہ عطاء اللہ ایک تو یہ یونہی کھلنڈرے اور ہنسوڑ طبیعت کے نوجوان تھے۔ یہاں اُن کو ساتھی بھی مل گئے۔ کچھ یہاں کے اقامت پذیر طلباء اور دو تین نوجوان میرے ماموں صاحبان یہ سب انکے ساتھی اور دوست تھے۔ عطاء اللہ شاہ بچپن سے ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی کے آدمی تھے۔ یہاں ان کا خوب جی لگا۔ صبح اور شام حافظ صاحب مجھے قرآن شریف اور دوسری کتابیں پڑھاتے۔ ان وقتوں میں پڑھنے کے لئے سید شاہ عطاء اللہ بھی پکڑے جاتے اکثر ان کے ساتھ یہ ہوتا کہ تھوڑا سا پڑھ کر یہ جناب حافظ صاحب سے کہتے کہ اب نہیں پڑھوں گا اور حافظ صاحب فرماتے کہ اچھا کتابیں اٹھا لو اور جاؤ۔ میں

حافظ صاحب تقریباً ساڑھے چار سال میرے یہاں مستقل طور پر رہے

نے دیکھا کہ یہ پڑھنے سے چھٹکارا پانے کی اچھی ترکیب ہے چنانچہ ایک دفعہ یہی داؤ میں نے بھی استعمال کیا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے بھی حافظ صاحب سے کہا کہ اب نہ پڑھوں گا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ گلو خلاصی ہو جائے گی مگر میرے اس کہنے پر ایک زلزلہ آیا۔ جناب حافظ صاحب گرج کر بولے تو نہیں پڑھے گا تو تیرا کچومر نکال دوں گا۔ عطاء اللہ کی پیروی کرنے چلا ہے تو اس کی ریس نہ کر۔ حقیقت یہ تھی کہ سید شاہ عطاء اللہ اگر چہ ان کے بیٹے تھے مگر جناب حافظ صاحب مجھے بھی ان سے کم نہ سمجھتے تھے اور بڑی محبت کرتے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ سید شاہ عطاء اللہ بچپن ہی سے آزاد منش اور ایک حد تک سرکش بھی تھے

اور اسی لئے جناب حافظ صاحب ان پر زیادہ سختی بھی نہیں کرتے تھے۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے دل جوئی بھی کرتے تھے۔ جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین کی تجارت یہاں بھی جاری تھی۔ کبھی خود معزز خریدار آپ کے پاس آ جاتے کبھی یہ ایسے لوگوں کے یہاں جاتے تو انکے حسب فرمائش شال دو شالے خریدنا چاہتے اگر پسند کی چیزیں نہ ہوتیں تو کاشمیر سے خط لکھ کر منگواتے اور ان کو دیتے۔

جناب حافظ صاحب تقریباً ساڑھے چار سال میرے یہاں مستقل طور پر رہے اور عطاء اللہ شاہ صاحب بھی ان کے ساتھ یہاں رہے۔ آخر میں عطاء اللہ شاہ صاحب میرے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے۔ ایک دفعہ میرے ایک ماموں عبد الحفیظ صاحب جو دیہات میں رہتے تھے انکو اپنے ساتھ دیہات لے گئے وہاں یہ پانچ چھ مہینے رہ گئے ان کا خوب جی لگا دیہات کے لہلہاتے کھیت ان کو خوب پسند آئے۔ دیہات کی ندیوں میں مچھلی کا شکار ان کو خوب پسند آیا۔ بڑے بڑے جال، جسے زمین پر بچھا کر تیتر اور بٹیر پکڑے جاتے ہیں اور جس کو چاتر کہتے ہیں اس سے تیتر اور بٹیر کا شکار کرتے ہیں یہ خوب مشاق ہو گئے۔ انہیں دنوں جب میرے والد مرحوم بھوپال سے کچھ دنوں کی رخصت لیکر آئے تو وہ عطاء اللہ شاہ صاحب سے

بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ انکو اپنے ساتھ لے گئے۔ بھوپال میں یہ آٹھ نو مہینے رہے۔ وہاں کی روداد یہ بڑے مزے میں بیان کرتے تھے۔ جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب صدر گلی میں تھے تو ایک دو دفعہ چند ہفتوں کے لئے اپنے گھر گجرات پنجاب بھی ہو آئے یہاں انہوں نے عطاء اللہ شاہ کی والدہ کے انتقال کے بعد اپنی برادری

پنجاب ہی میں عطاء اللہ شاہ نے اپنی عربی تعلیم مکمل کی۔

میں دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ محترمہ بڑی خدا ترس، عبادت گزار اور حافظ بھی تھیں۔ ان سے جناب حافظ صاحب کو ایک لڑکا بھی تھا۔ (حضرت امیر شریعت کے علاتی بھائی سید عطاء الرحمٰن شاہ صاحب جن کا گزشتہ دنوں انتقال ہو گیا: مرتب) جب والد صاحب مرحوم ۱۹۱۱ء میں بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس آ گئے تو جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب پھر واپس اپنے گھر واقع محلہ لنگوٹ گلی چلے گئے مگر ہفتہ میں دو تین دفعہ صدر گلی ضرور آ جاتے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب مستقلاً اپنے گھر گجرات پنجاب چلے گئے۔ اور ان کے ساتھ عطاء اللہ شاہ بھی گئے۔ پنجاب ہی میں (امرتسر شہر میں) عطاء اللہ شاہ نے اپنی عربی تعلیم مکمل کی اور مدرسہ سے نکلے تو اپنے ساتھ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت اپنے جلو میں لیکر نکلے۔

تقریباً عطاء اللہ شاہ صاحب کو پٹنہ سے گئے ہوئے نو دس سال ہوئے ہوں گے کہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں اور اُن کی بصیرت

متاعِ غمِ میری

چراغ درد دلوں میں جلا کے چھوڑ گیا
وہ ساری قوم کو اپنا بنا کے چھوڑ گیا
تمام عمر جلاتا رہا ہے شمعِ وفا
وہ جس کا ثانی زمانے میں دوسرا نہ ہوا
خلوص و مہر کی تصویر بن کے آیا تھا
حسین خواب کی تعبیر بن کے آیا تھا
تھی اس کے حسنِ تلاوت میں بارشِ انوار
دلوں کو چیر گئی اس کی شوخیٔ گفتار
تھا اس کے فقر میں انداز کجکلاہی کا
لباسِ سادہ میں پنہاں تھا رعب شاہی کا
حدیثِ عشق سرِ دار بولنے والا
صداقتوں کو ترازو میں تولنے والا
اُسی کی یاد ہے "حافظ" متاعِ غم میری
"خراج" شاہ کو دیتی ہے چشمِ نم میری

حافظ لدھیانوی

افروز تقریر دو ایک جگہ ہوئی جس میں لوگوں کا بڑا مجمع تھا اور ایک تقریر اسی دن پٹنہ سٹی کی جامع مسجد مدرسہ پر رات میں ہوئی یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا جبکہ عدم تعاون کا ہر طرف پرچار تھا اور اسکول و کالج کی تعلیم کا طلباء بائیکاٹ کر رہے تھے۔ اس خبر کو کہ مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں کچھ ہی دیر گزری تھی کہ والد صاحب مرحوم کا ملازم خاص

مجھے ان کے کمرے میں بلانے کے لئے آیا۔ جب میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک مولانا نما لحیم شحیم بزرگ بیٹھے ہیں، چہرے پر درمیانی درجہ کی داڑھی ہے، کھادی کا کرتہ اور اسی کا پائجامہ ہے اور سر پر چپکی ہوئی کھادی کی گول ٹوپی مجھے

وہ لپک کر اٹھے اور مجھے بغل میں داب کر زمین سے ایک فٹ اونچا اٹھالیا۔

دیکھ کر والد مرحوم نے ان حضرت سے کہا کہ لو میاں بدر الدین آ گئے۔ اب مولانا میری طرف پلٹے تو بڑی حد تک چہرہ جانا پہچانا نظر آیا۔ وہ لپک کر اٹھے اور مجھے بغل میں داب کر تقریباً زمین سے ایک فٹ اونچا اٹھا لیا اور میرا بھائی میرا بھائی کہتے ہوئے میری ہڈیاں اور پسلیاں چور کرنے لگے۔ بعد میں جب ان کو خود احساس ہوا کہ مجھے زور سے بھینچے ہوئے ہیں تو ہنس کر مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے بغور دیکھا تو عطاء اللہ تو غائب تھے یہاں مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری بیٹھے ہیں۔ چہرے کا کھلنڈرا پن صاف ہو چکا تھا، پیشانی پر سنجیدگی کی شکنیں تھیں، داڑھی شرعی حد میں تھی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھ کی چمک یہ کہہ رہی تھی کہ ہم وہی عطاء اللہ ہیں جو پہلے تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھ سے میرے پڑھنے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا کہ بی۔ اے میں پڑھتا ہوں پھر میرے بچپن کے قصے سنانے لگے۔ یہ والد مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم سرکاری گروپ کے آدمی تھے کیونکہ خان بہادر بھی تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کانگریس کے بڑے سرگرم رکن اور پنجاب کی احرار جماعت کے روح رواں بھی تھے۔ مگر ذرہ برابر بھی میرے

گھر میں انہوں نے سیاست کا [illegible] اور اسکول و کالج کے طلباء سے تعلیم کی [illegible] اپنی گفتگو اور تقریروں میں کرتے پھرتے مگر میرے یہاں

اس دفعہ پٹنہ میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا استقبال بڑی شدومد سے ہوا

سوائے نجی حالات پر گفتگو کے سیاست کا ذکر نہ آنے دیا۔ دن بھر میرے یہاں رہے ان کے رفقاء پٹنہ میں ایک دوسری جگہ مقیم تھے اور یہ انہیں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے برس والد مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ انکا لاہور سے تعزیت کا خط آیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ جناب حافظ سید شاہ ضیاء الدین صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ پانچ چھ برس کے بعد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پٹنہ پھر اپنے دورے پر آئے اس وقت ملک کی آزادی کی پکار اور بڑھ گئی تھی۔ اور سیاست اب عوام میں رچ بس رہی تھی۔ اس دفعہ پٹنہ میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا استقبال بڑی شدومد سے ہوا۔ جوق کے جوق لوگ ان سے ملاقات کرنے کو اور انکی تقریر سننے کو اُمڈے پڑتے تھے۔ تقریریں ایسی ہوتی تھیں کہ گھنٹوں سنتے رہے مگر سیری نہ ہو۔ روتوں کو ہنسا دیں، ہنستوں کو رلا دیں اور چاہیں تو پانی میں آگ لگا دیں۔ تقریر کرتے وقت عوام کے جذبات کی باگ ڈور انکے ہاتھ میں ہوتی۔ جس طرف اور جس طرح چاہتیں موڑ دیں۔ انکی تقریریں صرف ہیجانی نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ تاریخی اور سیاسی مواد کے ساتھ ساتھ مذہبی ہدایات کے سلسلے بھی ان کی تقریروں میں جاری رہتے تھے۔ میں نے

مولانا ابوالکلام آزاد کی پر مغز اور پروقار تقریریں بھی سنی ہیں، حیدر آباد کے بہادر یار جنگ کو بھی بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کرتے دیکھا ہے مگر انکی وہ معجز بیانی جو دل و دماغ کو سرشار کرتی تھی۔ اسے خدا نے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کے حصہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پٹنہ سے ان کو بے پناہ محبت تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ پٹنہ ہی میں وہ پیدا ہوئے، ماں کا بیحد و بے پایاں پیار ان کو یہیں ملا، انکا بچپن اور ان کا عنفوان شباب یہیں کی فضاء میں پروان چڑھا، انکے اُبھرتے ہوئے شعور نے یہیں کے ماحول میں انگڑائی لی اور ان کی صلاحیتوں کی پہلی تربیت یہیں کی آب و ہوا میں ہوئی۔ یہ جب بھی پٹنہ آتے تو یہاں کی ہر تقریر میں اپنے پیارے پٹنہ کی روداد سناتے یہاں کے لوگوں کا ہر تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے اور لوگوں سے کہتے کہ پٹنہ بھی ان کا ویسا ہی وطن ہے جیسا پنجاب ہے۔ وہ اجنبی نہیں ہیں ان کا خمیر بھی پٹنہ ہی کے خمیر سے بنا ہے۔ میرے ایک عزیز ماموں زاد بھائی سید حسین احمد مرحوم پنجاب گئے۔ یہ ۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا۔ لاہور کے اسٹیشن پر آگے جانے کو گاڑی لگی ہوئی تھی۔ انکو کراچی جانا تھا۔ ابھی ٹرین کے کھلنے میں دیر تھی۔ یہ ایک کمپارٹمنٹ میں جا کر بیٹھ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جماعت چالیس پچاس آدمیوں کی آتی دکھائی دی جس میں ایک شخص بہت نمایاں تھے، ادھیڑ عمر کے، اچھے ہاتھ پاؤں کے، یہ مولانا اپنی گفتگو سے سبھوں کو محفوظ کرتے ہوئے مجمع میں سبھوں کے لیڈر معلوم ہوتے تھے۔ حسین احمد مرحوم کا کمپارٹمنٹ سامنے ہی پڑتا تھا۔ مولانا صاحب نے سیدھے اسی کا رخ کیا اور آکر اسی کے ایک خالی برتھ پر بیٹھے۔ جو پلیٹ فارم سے لگا ہوا تھا۔ ساتھیوں میں کچھ تو انکے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ میں آکر بیٹھے مگر زیادہ تعداد انکے ساتھیوں کی پلیٹ فارم ہی پر رہی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین نے چلنے کی سیٹی دی۔ اور ٹرین چل

شاہ جی کی لسانی خدمات

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان ان ہر سہ حضرات نے اردو زبان کو سینکڑوں سیاسی الفاظ اور سیاسی مصطلحات دی ہیں بلکہ اردو کا سیاسی لغت تیار کرنے میں ان حضرات کا نمایاں حصہ ہے لیکن شاہ جی نے محض ایک خطیب ہو کر اردو کو بہت کچھ دیا ہے۔

۱۔ انہوں نے اردو خطابت میں بے ساختہ پن پیدا کیا اور اپنے طرز بیان سے ثابت کیا کہ نفاست زبان ہی خطابت کا حقیقی جوہر ہے۔

۲۔ بعض سیاسی حالات کی مطابقت سے بیسیوں محاورے اور کتنی ہی اچھوتی ترکیبیں ایجاد کیں جن کا اس سے پہلے اردو میں تصور تک نہ تھا۔

۳۔ جن علاقوں (بالخصوص پنجاب کے شمال مغربی اضلاع) میں اردو کا وجود اجنبی تھا، وہاں نہ صرف اردو کا مذاق عام کیا بلکہ لوگوں کو شوق دلایا کہ وہ اردو کو دفتری ضرورت کی بجائے قومی ثقافت کا حصہ سمجھیں۔

۴۔ اردو کو پنجابی خاندان کے ڈرائنگ روموں سے نکالا اور کوچہ و بازار تک پہنچانے میں گراں قدر حصہ لیا۔

پڑی۔ اب مولانا نے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا تو ایک طرف حسین احمد مرحوم پر نظر پڑی۔ انکی وضع قطع پٹنہ والوں جیسی نمایاں تھی۔ مولانا اپنی نشست سے اٹھ کر ان کے برتھ پر آ گئے۔ اور پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ پٹنہ وطن ہے وہیں سے آ رہا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ غریب خانہ پٹنہ کے ایک محلہ صدر گلی میں ہے۔ یہ سن کر مولانا کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کیا تم حسنو ہو؟ انہوں نے کہا ہاں میں حسنو ہی ہوں مگر آپ نے کس طرح سمجھا مولانا نے حسین احمد مرحوم کو ہنستے ہوئے کہا کہ جسے گود میں کھلایا، جس کے والد صاحب کے ساتھ مہینوں ان کے دیہات پر جا کر انکے ساتھ رہا، پھر پٹنہ میں ان کا ساتھ رہا اس کو کیوں نہ پہچانتا حسین احمد مرحوم سمجھ گئے کہ یہی عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ نے پٹنہ کے جانے پہچانے لوگوں کا نام لیکر خیریت پوچھی گھر کے ہر فرد نوکر چاکر دائی

قوم کی خدمت کرنے کی سزا مجھے تو قید تنہائی سے ملتی ہے، آج کل بھی وہی سزا ہے۔

ماما سب کا حال فرداً فرداً دریافت کیا۔ پھر پوچھا میرا بھائی بدر الدین کس حال میں ہے۔ مراد مجھ سے تھی۔ حسین احمد نے کہا کہ آج کل وہ بھی لیڈر ہیں۔ اس پر مولانا عطاء اللہ شاہ خوب ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہونا ہی تھا ایک بھائی لیڈر تو دوسرا کیوں نہیں ہو گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں تو جماعت احرار میں ہوں اس لئے بدر الدین ضرور مسلم لیگ میں ہوں گے۔ حسین احمد مرحوم نے کہا کہ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے۔۔۔۔ پھر حسین احمد مرحوم پر زور دینے لگے کہ وہ دو ایک دن ان کے ساتھ رہیں مگر اپنا ضروری کام بتا کر حسین احمد مرحوم نے معذرت کر لی۔ اور کہا کہ بعد میں وہ مولانا عطاء اللہ شاہ سے ملیں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا جب حسین احمد مرحوم گھر واپس آئے تو مجھے یہ قصہ سنایا۔

غالباً ۱۹۳۷ء میں رہتک جیل میں سے ایک خط میرے نام آیا مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ رہتک جیل سے مجھے خط بھیجنے والا کون ہے۔ لفافہ چاک کیا تو اندر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خط تھا۔ مجھے آج تک اس خط کا مضمون یاد ہے۔ لکھا تھا میرے پیارے بھائی بدر الدین آج کل جیل کی تنہائی میں تم مجھے یاد آتے ہو، زمانہ دراز سے تمہیں نہیں دیکھا غالباً اس کی کسر بار بار تمہارے یاد آنے سے نکل رہی ہے، قوم کی خدمت کرنے کی سزا مجھے تو قید تنہائی سے ملتی ہے، آج کل بھی وہی سزا ہے۔ تنہائی کو دور کرنے کے لئے میں نے کھادی کے کپڑے کے تھان کو

پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید فیصل آباد

اِک مردِ آہن وہ بھی تھا

گلشن شاداب میں اک سوختہ تن وہ بھی تھا
قبر تک خالی گیا جو ایک دامن وہ بھی تھا
آج تک لرزاں ہیں جس کی لے سے اذہان فرنگ
ملت خوابیدہ کے سینے کی دھڑکن وہ بھی تھا
مصلحت کیشوں کے انبوہ فراواں میں ریاض
جو نہ جھکتا تھا کبھی، اک مرد آہن وہ بھی تھا۔

اپنے ہاتھوں سے پیک کر کے تمہارا نام اور پتہ لکھا اور جیل والوں سے کہا کہ تمہارے پاس بھیج دیں۔ اس کو میری یاد گار سمجھ کر قبول کر لینا۔ برسوں گزر گئے مگر کھادی کا تھان مجھے نہ ملا۔ غالباً جیل والوں نے اپنے مصرف میں لے لیا ہو گا۔

۱۹۴۰ء میں میں لاہور گیا تو یہ خواہش لیکر گیا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اس وقت مسلم لیگ کا پنجاب میں بڑا زور تھا۔ دوسری مسلم سیاسی پارٹیاں جن میں جماعت احرار بھی تھی ماند ہو کر رہ گئیں تھیں۔ اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، سارے پنجاب میں امیر شریعت اور جاعت احرار کے سب سے اونچے لیڈر ہونے کے باوجود بھی پسِ پُشت ڈال دیئے گئے تھے۔ بہرحال میں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ تو جیل میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے بال بچوں کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ مولانا نے امرتسر میں مکان بنا لیا ہے (مصنف کو مغالطہ ہوا شاہ جی نے مکان بنایا نہیں تھا بلکہ بنا بنایا حضرت مولانا بہاؤالحق قاسمی رحمۃ اللہ علیہ سے قیمتہً خریدا تھا: مرتب) اب ان کے متعلقین وہیں رہتے ہیں۔ لاہور سے پٹنہ آنے کے راستہ امرتسر پڑتا تھا۔ مجھے گولڈن ٹمپل، جو سکھوں کی مشہور زمانہ عبادت گاہ ہے، اس کے دیکھنے کی بھی تمنا تھی۔ میں اور میرے دو ساتھی دن بھر کے لئے امرتسر اتر گئے، اسباب اسٹیشن ہی پر کلاک روم میں رکھا اور اسٹیشن پر ہوٹل میں کھا پی لیا، پھر گولڈن ٹمپل دیکھنے کو چلے گئے۔ ایک بڑے حلقہ میں گولڈن ٹمپل واقع ہے، بیچ میں بہت بڑا تالاب ہے، اس کے چاروں طرف خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں، تالاب کے بیچ میں بھی کئی سنگ مرمر کی عمارتیں ہیں۔ ایسی دلکش اور پر کشش کہ دیکھا کیجئے۔ کئی عمارتوں میں مقدس صورت مہنت بیٹھے گرنتھ صاحب کی تلاوت کر رہے تھے۔ گولڈن ٹمپل پہنچتے ہی ایک سن رسیدہ مہنت میرے ساتھ ہو گئے تھے اور ہر جگہ ہماری رہبری کر رہے تھے آخری میں سبھوں کو ایک بڑی خوبصورت سبک پل کے ذریعہ سے اس عمارت میں پہنچنا ہوتا تھا۔ میں وہاں

گولڈن ٹمپل پہنچتے ہی ایک سن رسیدہ مہنت میرے ساتھ ہو گئے

جذباتِ عقیدت

چاروں طرف تاریک سناٹا ہے نصف رات گزر چکی نصف باقی ہے۔ بمبئی کے ایک کھلے میدان میں جلسہ عام ہے۔ سمندر کی لہریں ٹھہری نظر آتی ہیں۔ شاہ جی نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے گئے۔ پندرہ منٹ قرآن، پانچ منٹ ترجمہ، دس منٹ تفسیر۔۔۔ پھر شعر۔۔۔ پھر قرآن۔۔۔ رات کمر کھولتی ہے۔ شاہ جی مضمون باندھتے ہیں۔ جب صبح ہو چکی تو ہندو سپتریاں بھی بے ساختہ داد دے اٹھیں: شاہ جی تو رشیوں کی زبان بولتے ہیں۔"

پہنچا تو ہمارے راہبر نے کہا کہ یہاں کے جو سب سے بڑے مہنت ہیں انہی کے پاس آپ کو لئے چلتا ہوں۔ اندر ایک سنگ مرمر کے تخت پر ایک بڑے باوقار سفید ریش بزرگ کو دیکھا جو گرنتھ جی کی تلاوت میں مشغول تھے۔ انہوں نے ہم تینوں کو دیکھا تو کتاب بند کر دی۔ ہم نے مودبانہ ان کو سلام کیا انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ پٹنہ سے۔ یہ سننا تھا کہ جھٹ اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا میرے ساتھیوں کو باری باری سے اور بڑی محبت سے کہنے لگے کہ آپ پٹنہ شریف سے آئے ہیں اس لئے ہم سبھوں کو سر آنکھوں پر آپ کا آنا ہے، آپ تو میرے معزز اور بڑے محبوب مہمان ہیں۔ پھر پوچھا کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں اور ہمارے رہبر سے کہا کہ بھائی مہمانوں کے اسباب لیجا کر مہمان خانہ میں ٹھیک ٹھاک کر کے رکھو۔ میں نے عرض کیا کہ ہم

ایک کشادہ گلی سے کچھ آگے ایک نئی عمارت کھڑی تھی

سب تو سر راہ ہیں، صرف گولڈن ٹمپل کی زیارت کی تمنا کھینچ کر لے آئی ہے اور آج ہی شام کے وقت پٹنہ روانہ ہو جائیں گے مگر بڑے مہنت صاحب ہم سبھوں کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر ہم سبھوں نے وعدہ کیا کہ دوبارہ آئیں گے تو انکی خدمت میں دو چار دن ضرور رہیں گے۔ پھر ہم سب وہاں سے رخصت ہوئے۔ آج تک گولڈن ٹمپل کے لوگوں کی محبت کا برتاؤ اور پٹنہ سے ان کی عقیدت اور پٹنہ والوں کے ساتھ انکا برادرانہ خلوص میرے دل پر نقش ہے۔

گولڈن ٹمپل سے چلے تو دو بج رہے تھے مولانا عطاء اللہ شاہ کا مکان کس محلہ میں واقع تھا یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا تھا۔ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آخر منزلِ مقصود تک پہنچ ہی گیا۔ ایک کشادہ گلی سے کچھ آگے بڑھ کر ایک کشادہ جگہ پر ایک نئی عمارت کھڑی تھی۔ سامنے ہی مردانہ نشست کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ جو بند تھا۔ اس کے بغل سے لگا ہوا ایک دروازہ تھا جو زنانہ حصہ میں جانے کا راستہ تھا۔ وہیں پر جا کر میں نے پکارا کہ کوئی صاحب ہیں؟ باہر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ پہلی ہی آواز پر ایک صاحب باہر آئے، تیس پنتیس سال کی عمر ہو گی، متوسط قد کے خوش رو آدمی تھے، چہرے پر خشخشی داڑھی تھی۔ ط۱

صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ آپ لوگ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں میں نے کہا کہ پہلے یہ تو بتایئے کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا یہی مکان ہے کہ نہیں؟ جواب ملا کہ مکان تو یہی ہے اور ان کی اہلیہ اور بچیاں اسی مکان میں ہیں مگر مولانا جیل میں ہیں۔ میں نے کہا کہ مولانا کا جیل جانا معلوم ہے۔ آپ انکی اہلیہ سے یہ کہہ دیں کہ بدرالدین پٹنہ سے آیا ہے۔ وہ صاحب یہ سن کر اندر گئے پانچ منٹ بعد باہر کی نشست گاہ کھلی، اچھا خاصہ کمرہ تھا۔ فرنیچر میں صوفے اور کرسیاں سب تھیں۔ ہم سب کمرے میں پہنچے تو تین بچیاں میرے سامنے کھڑی تھیں، بڑی کی عمر نو سال ہو گی، دوسری تقریباً سات سال اور چھوٹی پانچ چھ

ط۱ (نوجوان سے مراد حضرت امیر شریعت کے برادر نسبتی سید عبدالحمید شاہ بخاری مرحوم ہیں یعنی حضرت ابو معاویہ مدظلہ کے ماموں)

سال کی۔ ص۱

سب آکر مجھ سے لپٹ گئیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر ان سبھوں نے مجھے کس طرح پہچانا۔ میں نے سبھی کو پیار کے بعد انکے نام پوچھے۔ اتنے میں بڑی لڑکی لپک کر اندر گئی اور پھر دو تین منٹ میں باہر آئی اور کہنے لگی کہ امی جان آپ کو سلام کہتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں آپ کو چار پانچ دن یہاں رہنا ہے۔ میں نے کہا کہ تم اپنی امی جان کو میرا سلام کہو، میں تو

میں نے ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انہیں نہیں دیکھا، مگر آج بھی ان کی یاد آتی ہے تو دل بے قرار ہوجاتا ہے

صرف تم سبھوں کو دیکھنے کے لئے آگیا تھا۔ بھائی جان جیل میں ہیں اس لئے رہ کر کیا کروں گا۔ بڑی لڑکی نے جواب دیا کہ امی جان اور ہم سب تو ہیں۔ ابا جان ہمیشہ آپ کا ذکر ہم سبھوں سے کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرا ایک بھائی بدر الدین پٹنہ میں ہے۔ اللہ اللہ مولانا عطاء اللہ شاہ کی محبت کہ طویل زمانہ گزرنے پر بھی انکی محبت میرے ساتھ کم نہ ہوئی۔ بچیوں کا اصرار کہ میں دو چار روز قیام کروں میرا یہ عالم کہ بچیوں سے گفتگو کے درمیان سارے گزشتہ واقعات کی تصویر نظر کے سامنے گھومتی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بچیوں کو سمجھا رہا ہوں مگر وہ بہ ضد ہیں کہ میں قیام کروں۔ اتنے میں ... اہلیہ نے بڑا پر تکلف ناشتہ ہم سبھوں کے لئے بھیجا ... کو بھی ناشتہ میں شامل کر لیا۔ وہ صاحب جو پہلے آ کر ... سبھوں سے ملے تھے ان کے متعلق ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا کے سالے ہیں۔ وہ بھی میزبانی میں پیش ... رہے تھے۔ ناشتہ کر کے میں نے مولانا کی اہلیہ سے اپنی مجبوری کہلا بھیجی کہ آج میرا پٹنہ روانہ ہوجانا بہت ضروری ہے۔ مولانا کی اہلیہ سے تو اجازت حاصل کر لی مگر بچیاں میری جان چھوڑنے پر تیار نہ تھیں۔ آخر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے ہم سب سیدھے اسٹیشن روانہ ہوگئے مگر وہ دن اور آج کا دن میں نے پھر ان بچیوں کو دیکھا نہیں۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ جذبات بدل گئے۔ لہلہاتے درخت خشک ہو کر پیوند زمین ہو گئے، ان کی جگہ پر نئے پودے نکل کر تناور درخت بن گئے مگر پرانی یادیں پہلے ہی کی طرح آج بھی دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی گزر گئے۔ میں نے ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انہیں نہیں دیکھا مگر آج بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو دل بیقرار ہو جاتا ہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے قومی خدمات کا ایک طویل اور شاندار ریکارڈ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ جمعیۃ العلماء کو انہوں نے پروان چڑھایا، پنجاب میں امارت شرعیہ انہی کے دم سے پھلی پھولی، احراریوں کو انہوں نے قوت اور روشنی بخشی، پنجاب میں ملکی سیاست کو اونچی سیڑھیوں پر وہی لائے، انہی کی معجز بیانی سے ہندوستانی سپوت ملک پر نثار ہونے کے لئے تیار ہو کر سینوں پر انگریزوں کی گولیاں کھاتے تھے۔ انگریزوں کے لئے توپ اور رائفل سے زیادہ خطرناک مولانا عطاء اللہ شاہ کی آتش

ص۱ (ان میں حضرت امیر شریعت کی ایک صاحبزادی اور باقی گھر میں حرم امیر شریعت سے تعلیم حاصل کرنے والی بچیاں تھیں۔ جبکہ مصنف کا یہ گمان کہ وہ تینوں حضرۃ شاہ صاحب کی صاحبزادیاں تھیں غلط ہے۔)

نوائی تھی جو دم کے دم میں نہتے لوگوں کو انگریزوں سے ٹکر لینے کے لئے ان کے رائفل کے مقابل بھیج دیتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ حکومت کے قید و بند کی برابر زینت بنے رہے۔ آج مولانا نہیں ہیں مگر ان کی عظیم المرتبت داستان حیات باقی ہے۔



اندازِ سُخن

درگاہ امام ناصر جالندھر کے جلسے میں کسی نے اس وقت کے اختلافی مسئلہ چھیڑ دیا۔ مخالفوں نے شاہ جی سے متعلق مشہور کر رکھا تھا کہ وہابی ہیں۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ کا زیارت قبور کے متعلق کیا خیال ہے۔ فرمایا۔

اپنے اپنے ظرف اور ذہن کی بات ہے کچھ لوگ انگور نعمت خداوندی سمجھ کر کھاتے ہیں کچھ اس میں سے شراب نکالتے اور عقل کی بازی بدلتے ہیں۔ میں بھی مزار کی زیارت کر کے آیا ہوں۔ اور تم بھی زیارت کرتے ہو۔ میں خدا کے فضل سے کچھ لے کر آیا ہوں اور تم ایمان میں سے کچھ دے کر آتے ہو۔

"سُبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا"

زیارت القبور کا اختلافی مسئلہ کس عمدگی سے ذہن نشین کرایا ہے۔ بعض مُدعیان توحید کی طرح زیارت القبور سے روکا نہیں۔ نہ کسی پر حملہ کر کے دلآزاری کرتے ہوئے سامعین کو حق سننے سے بیزار کر دیا۔ بلکہ خود زیارت کر کے ان کو اپنی طرف مائل کیا۔ پھر فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ شرعی حدود کا خیال رکھنا چاہیے مثلاً قبر والے کو لینے دینے والا سمجھ کر اس سے مرادیں نہ مانگنی چاہیں۔ بلکہ اس کے لئے اور اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنی چاہیے۔ کچھ قرآن شریف پڑھ کر انکو ثواب پہنچانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہوئے ان الفاظ میں ان سے توسل کرتے کہ اے اللہ اس پیارے بندے کے توسل سے ہمارے گناہ معاف کر دے۔ جیسے کہ علماء دیوبند نے اس کی اجازت دی ہے۔ ایک اور مطلب بھی ہے جب اہل دل اور صاحب نسبت بزرگ کسی ایسے ولی کی قبر پر جا کر مراقبہ کرتے ہیں۔ تو ایک دوسرے کی روحانیت یا نورانیت اثر انداز ہوتی ہے۔ جیسے کہ آگ کے پاس بیٹھنے سے حرارت محسوس ہوتی ہے۔ یہ وہ استعانت نہیں ہے۔ کہ ہم قبر والے سے کہیں کہ مجھے اولاد دے یا میری مراد پوری کر۔ اس طرح زیارت حضرت شاہ صاحب نے خود کر کے انکو مسئلہ سننے اور سمجھنے پر آمادہ فرمایا۔

تم میرے بارے میں جو چاہو سوچو مسلمانوں کا یہ شعار ہو گیا ہے کہ وہ برائیاں عقاب کی نظر سے چنتا اور صبا کی رفتار سے پکڑتا ہے کبھی کبھی نیکیوں پر بھی نگاہ کر لیا کرو۔
تمہاری نظریں اس سے خوبصورت ہوتی چلی جائیں گی۔



عکسِ سیرۃ

ایک غیر معلوم الاسم نیاز مند کی ڈائری سے یادوں کے چند ورق

بہار ہی سے نہیں ہیں واقف، خزاں کے ظلموں کو کیا وہ جانیں
یہ داغ تو ہے اُنہی کے دل پر جو محوِ رنگِ چمن رہے ہیں

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی چند یادداشتیں عرض کر رہا ہوں۔ حضرت کی صحبت میں ایک دن بیمار پرسی کے لیے میں گیا تو دیکھا چند مرید بیٹھے تھے۔ ان مریدوں میں سے ایک مرید نے کہا حضرت میرے پاس چھ ہزار روپیہ ہے۔ میں آپکو بطور تحفہ پیش کر رہا ہوں آپ اسے قبول فرمائیے۔ آپ کرائے کے مکان میں کیوں رہتے ہیں ایک اور مرید ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے کہا میرے پاس چار ہزار روپیہ نقد ہے۔ میں نے کئی بار آپ سے کہا ہے کہ وہ قبول فرما لیں۔ آپ نے توجہ نہیں فرمائی شاہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ دس ہزار روپیہ ہو گیا اب مکان تلاش کرو۔ انہوں نے عرض کی اب ہم سے آپ پیسے لے لیں۔ جب کہیں مکان ملے لے لینا۔ حضرت کی طبیعت میں اتنا غناء تھا کہ دس ہزار پر توجہ نہ فرمائی بس ہنس دئیے۔ آپ وقت کے بہت بڑے قلندر تھے۔ فرمایا میں نے کیا جائیداد بنانی ہے۔ ایک روپیہ روزانہ کرائے کا دیتا ہوں ایک روپیہ کی سبزی ترکاری آ جاتی ہے۔ دو چار روپے میں گزارا ہو جاتا ہے۔ میں نے جائیداد کیا کرنی ہے۔

ایک بار میں رات کو حضرت کے ہاں عیادت کے لئے گیا آپ بیمار تھے۔ آپ سو رہے تھے۔ رات آٹھ بجے کا وقت تھا دو مرید آپ کو دبا رہے تھے۔ آپ کی طبیعت ناساز تھی۔ تھوڑی سی نیند آ گئی۔ مرید دباتے رہے جب نیند سے آنکھ کھلی تو ۱۲ بج چکے تھے۔ حضرت نے فرمایا کیا ٹائم ہو گیا ہے۔ میں نے عرض کیا ۱۲ بجے ہیں تو حضرت نے کہا اتنی دیر ہو گئی تو جو خادم دبا رہے تھے انکو کہا کہ بہت دیر ہو گئی ہے آپ جائیں۔ انہوں نے عرض کی حضرت ہم پر کچھ توجہ فرمائیں تو آپ نے برجستہ فرمایا کہ دیکھیں (الماری کی طرف اشارہ کر کے جس میں بہت سی دوائیوں کی شیشیاں پڑیں تھیں) آپ نے فرمایا دیکھو اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اپنا پیشاب بند نہیں کر سکا تو آپ پر کیا توجہ کروں۔ (آپکو اس وقت ذیابیطس کی تکلیف تھی) آپ کے لیے اللہ سے دعاء کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ آپکو اجر عظیم عطاء فرمادے۔ آپکا کسرِ نفسی کا یہ عالم تھا کہ کسی مرید کو کوئی فریب نہیں دیتے تھے سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے میں جمعہ نماز پڑھ کر حاضر ہوا

تو آپ چارپائی پر سو رہے تھے۔ مولانا محمد علی دروازے سے نکل رہے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو آواز سنی آپ مولانا صاحب کو مخاطب ہو کر فرما رہے تھے کہ مولانا مجھ پر رحم کرنا مولانا واپس حضرت شاہ جی کے پاس واپس آگئے میں بھی اتنے میں پہنچ گیا۔ دونوں حضرت کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے عرض کی حضرت کیا فرما رہے تھے۔؟ انہوں نے فرمایا میں کہہ رہا ہوں۔ کہ مجھے چارپائی پہ گداگری نہ کرانا تو میں نے عرض کی حضرت وہ کیسے؟ تو فرمایا دیکھا نہیں کبھی ایک مریض رہڑی پہ ہوتا ہے دوسرا رہڑی کھینچ رہا ہوتا ہے۔ اور اشارہ کرتا ہے مریض کی طرف کہ انکو دیکھو یہ بیمار ہے انکو پیسے دو! تو یہی ان سے عرض کیا ہے کہ میرے دوستوں مریدوں ملنے والوں کو یہ نہ کہیں کہ حضرت کی خبر بھی آپکو ہے کہ گھر بیمار پڑے ہیں۔ اور کبھی آپکی بیمار پُرسی بھی کی ہے تو پھر انکو توجہ دلائیں کہ حضرت کی خدمت کرو تو یہ گداگری نہیں ہو گی تو کیا ہو گا۔ آپ مجھ پر رحم کرنا کہ ایسا کسی مرید یا ملنے والوں کو یہ نہ کہنا اور نہ کوئی تحفہ جو کوئی دے تو مجھ تک لے آنا مجھے یہ بات ناگوار گزرے گی۔ مطلب یہ کہ ہر حال میں اللہ کی رضا پہ راضی رہنا چاہتے تھے کسی سے دست سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کوئی دینے آتا تو اسکو بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ کہہ دیتے تھے مجھے ضرورت نہیں، ان کی نظر میں رزق حلال مقصود تھا۔ وہ کسی عام آدمی سے یعنی بغیر جان پہچان پیسہ نہیں لیتے تھے۔ یعنی رزق حلال کی تلاش تھی ایک دن شام کو ایک شخص آیا آپ سے دعاء سلام کی بیٹھا رہا باتیں کرتا رہا پھر دو سو روپیہ اپنی جیب سے نکالا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت نے لے لئے۔ جب وہ اٹھنے لگا تو حضرت نے فرمایا آپ کا مشغلہ کیا ہے انہوں نے عرض کی حضرت میں پٹواری ہوں، جب جانے لگا تو حضرت نے وہ دو سو روپیہ اپنی جیب سے نکال کر اسکی جیب میں ڈال دیا۔ تو وہ بہت سیانا آدمی تھا سمجھ گیا تو اس نے عرض کی حضرت میں یہ پیسے دو سو روپیہ اپنی تنخواہ سے دے رہا ہوں آپ قبول فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا میں نے کچھ کہا تو نہیں۔ حضرت نے فرمایا آپ میرے پاس پہلے کبھی نہیں آئے پہلی بار آئے ہیں میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ آپ نے مجھے تحفتہً دو سو روپے دیئے ہیں تو آپ میری طرف سے یہ دو سو روپے قبول کر لیں اسکو دو سو روپے دے دیئے وہ چلا گیا۔ حضرت نے صرف اس لئے وہ پیسے واپس کر دیئے کہ پٹواری کی کمائی رشوت کی ہوتی ہے۔ حضرت ہمیشہ مشکوک مال سے بچتے رہے اور رزق حلال کی تلاش میں رہے۔

ایک مرید حضرت کے پاس آیا اس نے فرمایا شاہ جی میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میری اولاد نہیں ہے میرے پاس چھ سات مربع زمین ہے ایک مربع میں آپکی خدمت میں بطور تحفہ پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے قبول فرما لیں شاہ جی ہنس پڑے اور فرمایا ایک مربع کیوں کہتے ہو جو تمہارے چھ سات مربع ہیں وہ سب میرے ہی ہیں آپ میرے بیٹے ہیں، عزیز ہیں، مرید ہیں، آپ اس پر حل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں، پانی دیتے ہیں، جب فصل تیار ہوتی ہے تو کاٹتے ہیں، اس کو اُگاتے ہیں۔ جب گندم باہر آتی ہے تو سب سے پہلے میرا حصہ جو ہوتا ہے بوریاں بھر کر آپ میرے گھر پہنچا دیتے ہیں۔ یہ اچھا ہے یا وہ اچھا ہے کہ میں وہاں جاؤں گندم بوؤں، ہل چلاؤں، فصل کاٹوں، پھر گھر لاؤں۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ کہ گھر بیٹھے بٹھائے جو تم پہنچا دیتے ہو مل جاتا ہے۔ زمین میری نہیں ہے تم میرے کارندے ہو تم کما رہے ہو میں کھاتا ہوں۔ تو ایک مربع میں کیوں لوں جب ساری ہی میری ہے بہت ہنسے اور اسکو بھی ہنسایا۔ اور اُسکو سیریس نہیں ہونے

دیا بلکہ ہنس کر ٹال دیا۔ کیونکہ انکا مقصد زمین لینا نہیں تھا۔ بس اسکو خوش کر دیا اور زمین بھی نہ لی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ملتان میں مختار مسعود ڈپٹی کمشنر تھا۔ آپکی وفات سے کافی عرصے پہلے کی تقریباً ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء کی بات ہے انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں حضرت سے ملنا چاہتا ہوں۔ منشی عبدالرحمان مرحوم مشہور آدمی ہیں جن کا گھر کچہری روڈ ملتان پر تھا وہ مختار مسعود کے دوست تھے۔ وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے عرض کی کہ آپ سے ڈپٹی کمشنر ملتان مختار مسعود آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ فرمائیں تو میں انکو آپ کے پاس لے آؤں یا آپ مہربانی فرمائیں تو میں آپکو وہاں لیئے چلوں گا۔ وہ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ آپ اس وقت کسی موڈ میں تھے آپ نے منشی عبدالرحمان کو فرمایا کوئی بات نہیں میں چلوں گا۔ انہوں نے شاہ جی سے وقت لے لیا۔ اور مقررہ وقت پر کار لیئے حاضر خدمت ہو گئے۔ حضرت انکے ساتھ چل پڑے۔ مختار مسعود کی کوٹھی پر جب حضرت کار میں پہنچے تو مختار مسعود خود آئے۔ دروازہ کار کا خود کھولا شاہ جی کو بڑے اعزاز کے ساتھ اندر لے گئے۔ بٹھایا باتیں کرتے رہے کچھ سیاسی کچھ غیر سیاسی مختار مسعود نے کہا کہ حضرت مجھے تقریر کا بہت شوق ہے تو حضرت ہنس پڑے کہا تقریریں کیا کرو۔ تقریر کرنا آ جائے گا۔ باتیں ہوتی رہیں بہت سی، یہ ملاقات غالباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ جب حضرت رخصت ہونے لگے تو اس نے کہا حضرت میں نے ایک عرض کرنا ہے۔ شاہ جی نے فرمایا فرمائیں۔ اس نے کہا میں ملتان کا ڈپٹی کمشنر ہوں۔ گورنمنٹ نے مجھے اختیارات دیئے ہیں جو غیر آباد زمینیں پڑی ہیں ٹیوب ویل سکیم پر چھ چھ مربعے میں ہر شخص کو جس کو چاہوں دے سکتا ہوں۔ یہ میرے اختیار

اقبال ساجد مرحوم

روشن لکیر چھوڑ گیا

کمانِ شب سے سحر کار تیر چھوڑ گیا
ستارہ ٹوٹ کے روشن لکیر چھوڑ گیا
اب اس میں زہر ملاؤ؟ کہ تم مٹھاس پیو
پہاڑ کاٹ کے وہ جوئے شیر چھوڑ گیا
یہ اور بات کہ اس پر کوئی چلے نہ چلے؟
لکیر چھوڑنے والا لکیر چھوڑ گیا
پھر آج شہر کی سب سے بڑی حویلی میں
تمام دن کی کمائی فقیر چھوڑ گیا
زمینِ سنگ پہ وہ آئینہ بہ کفا ساجد
جو نقش چھوڑ گیا؟ دل پذیر چھوڑ گیا

میں ہے۔ میں نے آپ کے لئے چھ مربع تلاش کرائی ہے ایسی جو تمام زمینوں سے بہتر ہو پھر میں اس زمین پر خود گیا اپنے ایک دو زمیندار دوستوں کو ساتھ لے کر سارے عملے کو ساتھ لے کر گیا۔ زمین دیکھی سب نے یہی کہا کہ یہ (رقبہ) پلاٹ سب سے بہتر ہے۔ میں نے جناب کے لیے وہ چھ مربع زمین تجویز کی ہے۔ آپ اسے قبول فرما لیں۔ تو حضرت بہت ہنسے اور فرمانے لگے کہ مجھ پر یہی احسان کر رہے ہو کہ اس عمر میں زمیندار بن جاؤں۔ تحصیلدار کے گھر جاؤں اور پٹواری کے ہاں جاؤں۔ اس نے کہا نہیں حضرت آپکو کہیں نہیں جانا پڑے گا۔ میرے محکمہ زراعت میں بہت تعلقات ہیں میں ساری

زمین آپکو آباد کر کے دوں گا آپ قبول فرمالیں شاہ جی کو جب اس نے لاجواب کر دیا تو شاہ جی نے فرمایا بیٹا زمیندار تو نہ نانا تھے نہ دادا تھے۔ مطلب یہ کہ زمیندار تو نہ محمد ﷺ تھے نہ علی رضی اللہ عنہ تھے تو اب میں زمیندار کیسے بنوں؟ یہ سنت کے خلاف ہے پھر اس نے کہا کہ بیٹوں کے لیے جائیداد بن جائیگی کتنی اچھی بات ہے۔ شاہ جی نے فرمایا جس خدا نے مجھے ساری زندگی رزق دیا ہے میرے بچوں کا خدا بھی وہی ہے وہ زندہ ہے ابھی مرا نہیں ہے مجھے اسی پر آسرا ہے میرا رب میرے لئے کافی ہے۔ ڈپٹی کمشنر مختار مسعود نے یہاں سے جانے کے بعد ایک کتاب تحریر کی ہے کتاب کا نام اواز دوست ہے، اس اپنی کتاب میں بھی اس نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں حضرت کے ہاں بیٹھا تھا ایک شخص آیا اور حضرت کی خدمت میں اس نے کچھ پیسے تحفتہً پیش کئے۔ حضرت نے فرمایا تم مقروض ہو یہ پیسے قرض خواہ کو دے دو۔ میں نہیں لیتا۔ اس نے عرض کی حضرت میرے پاس مال بہت ہے۔ گائے ہے بکری ہے اور قرضہ میرا صرف ـــ دو تین سو ہے جبکہ اس سے زیادہ میرے پاس مال ہے۔ آپ یہ لے لیں حضرت نے فرمایا آقا کا حکم ہے قرض دار سے تحفہ وصول نہ کرو! تو حضرت نے اس سے تحفہ قبول نہ فرمایا۔

ملتان کے رہنے والے سابق گورنر سجاد حسین قریشی کے والد مخدوم مرید حسین تھے جن کو سر کا خطاب تھا۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ۱۹۵۰ء یا کم و بیش کی بات ہے ہر سال آتے۔ آپ بہت بڑے پیر تھے ہر سال آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دو سو روپیہ پیش کرتے آپ قبول فرما لیا کرتے وہ دعاء کے لئے عرض کرتے۔ اور دعاء کرا کر چلے جاتے۔ ایک سال آئے تو دو سو روپیہ پیش کیا۔ تو حضرت نے فرمایا مخدوم صاحب یہ آپ نے میرا وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ سال کے بعد آپ آتے ہیں اور دو سو روپیہ ہی دیتے ہیں۔ میں وظیفہ خوار نہیں ہوں۔ ساری زندگی میں مجھے بڑے بڑے وظیفوں کی پیش کش ہوئی۔ میں نے کوئی وظیفہ قبول نہیں کیا۔

ھمیں میدان ھمیں گو

قادیان کی تبلیغ کانفرنس (۱۹۳۴ء) میں آپ نے جو تقریر کی اس کی مقناطیسی کشش کا اعتراف مسٹر جی ڈی کھوسلہ نے اپنے فیصلے میں کیا ہے۔ اس ٹکڑے ہی سے جذبات کی معراج معلوم ہوتی ہے: خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"وہ (مرزا محمود) نبی کا بیٹا ہے، میں نبی ﷺ کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے اور مجھ سے اردو، پنجابی، فارسی میں ہر معاملے سے متعلق بحث کر لے یہ جھگڑا آج ہی طے پا جاتا ہے۔ وہ پردے سے باہر نکلے نقاب اٹھائے، کشتی لڑے، مولا علی کے جوہر دیکھے۔ ہر رنگ میں آئے، وہ موٹر میں بیٹھ کر آئے، میں ننگے پاؤں آؤں۔ وہ حریر و پرنیاں پہن کر آئے میں موٹا جھوٹا پہن کر آؤں وہ مزعفر کباب یاقوتیاں اور اپنے ابا کی سنت کے مطابق پلومر کی ٹانک وائن پی کر آئے میں نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کے آؤں۔" ہمیں میدان ہمیں گو"

انہوں نے کہا نہیں نہیں حضرت یہ وظیفہ نہیں ہے میں تو آپکا مرید ہوں آپ یہ تحفہ قبول کرلیں۔ حضرت نے یہ قبول نہیں کیا اور دو سو روپے واپس کر دیئے آپ نے پہلے ایک دو دفعہ تو بطور تحفہ کر کے لیا تھا لیکن اس بار اچانک خیال آیا کہ یہ تو دو سو روپیہ میرا وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ واپس کر دیا۔ انہوں نے بڑی منتیں کیں لکن قبول نہیں فرمایا۔ وہ چلے گئے اور بعد میں بھی آتے رہے۔ لیکن بعد میں اُن سے ساری زندگی کوئی پیسہ بارہا باوجود کوششوں کے نہیں لیا۔

جب ملتان میں شمس آباد سکیم بنی تو سعید احمد بخاری ایڈووکیٹ مرحوم نے یہ ساری کالونی الاٹ کی ایک پلاٹ ایک کنال کا بغیر درخواست کے حضرت کے نام الاٹ کر کے اسکا الاٹ نامہ شاہ جی کے ہاں بھیج دیا تو شاہ جی نے پوچھا یہ کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ شمس آباد میں ایک کنال پلاٹ آپکو الاٹ ہوا ہے آپ اسے قبول فرما لیں۔ شاہ جی نے پروانہ کھلایا اور ہنستے رہے کہ میں نے تو مانگا ہی نہیں ہے۔ یہ بن مانگے کیسے آگیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد حضرت نے وہ واپس کر دیا۔ پھر وہ ... صاحب خود بمعہ اپنے دوستوں کے حاضر خدمت ہو... عرض کی حضرت یہ پلاٹ آپ واپس نہ کریں۔ کیونکہ آپ کرائے کے مکان میں بیٹھے ہیں تو یہ اپنا بن جائے ... شاہ جی نے فرمایا ایک روپیہ روزانہ کرائے کا دیتا ہوں مکان اپنا ہی ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے اپنا مکان بنانے کی اور میرے پاس پیسہ بھی کہاں ہے۔ انہوں نے جواب دیا شاہ جی آپ پلاٹ قبول کرلیں ہم آپکو بنا بنایا دیں گے۔ شاہ جی ہنس دیئے اور فرمایا بیٹا اگر میں جائیداد بنانا چاہتا تو ہندوستان کے ہر شہر میں میری جائیداد ہوتی۔ میری زندگی کا مقصد جائیداد نہیں ہے۔

حاجی اسماعیل صاحب جن کی بوہڑ گیٹ کتابوں کی ساری مارکیٹ ملکیت ہے۔ ان کو سید عطاء المحسن بخاری جو کہ شاہ جی کے دوسرے بیٹے ہیں نے کہا کہ ایک دوکان مجھے کرائے پر چاہیئے۔ اس نے مجھے پیغام دیا کہ محسن بھائی کو کہہ دینا کہ دوکان فارغ ہو گئی ہے آئیں اور

سالارِ خطابت

اے مردِ جری! قافلہ سالارِ خطابت! — اندازِ خطابت ترا معیارِ خطابت!

لفظوں کی زلیخائی خجل حسن سے تیرے — اے یوسفِ معنیٰ! سرِ بازارِ خطابت!

وہ مہر علی شاہ کی مخمور نگاہیں — وا کر گئیں تجھ پر درِ اسرارِ خطابت



محمد افضل خاکسار فیصل آباد

لے لیں۔ میں نے جب محسن شاہ جی کو پیغام دیا تو حضرت شاہ جی اس وقت بیماری کی حالت میں اونگھ رہے تھے۔ بات سن لی اور کہا محسن بیٹے تم دو کان ڈالنا چاہتے ہو تو محسن نے کہا جی ہاں۔ تو شاہ جی نے کہا کہ محسن میں نے کئی بار آپ سے کہا ہے کہ آپ نے کاروبار نہیں کرنا اور اگر کچھ کرنا ہے تو پھر کہیں بیٹھ کر قرآن پڑھو اور پڑھاؤ۔ اللہ رزق کا مالک ہے ہم کاروبار کرنے نہیں آئے بس قرآن پڑھو اور پڑھاؤ۔

باتیں شاہ جی کی

دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے۔ اور وہ ہے انگریز۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے محبت اور نفرت کے یہ دو زاوئیے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں ان کا سودا ہو۔ ان کے لئے پا بہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے۔ جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانے کی آبرو پر بوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے۔

دوست زندانی مصائب سنانے میں لذت محسوس کرتے ہیں اور میں عیب، یہ اپنا اپنا زاویۂ نظر ہے میں ان مصیبتوں کو رسوا کرنے کا عادی نہیں۔ میرے لئے جیل خانہ صرف نقل مکانی ہے۔ اپنے گردو پیش باغ و بہار فراہم کر لیتا ہوں اور قید یوں گزر جاتی ہے جیسے صحراؤں سے بادل۔

ایک شب جیل خانہ میں سورۂ یوسف کی تلاوت کر رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ وہ قرأت کی تاثیر میں ڈوب کر ٹھہر گیا ہے۔ ایک گھنٹہ اسی تلاوت میں گزر گیا۔ اتنے میں پنڈت رام لال جی سپرنٹنڈنٹ جیل نے پیچھے سے پکارا۔ دیکھا تو وہ کھڑا ہے اور رخسار اس کے آنسوؤں سے تر ہیں۔ کہنے لگا شاہ جی خدا کے لئے بس کرو۔ میرا دل قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں۔ اللہ اللہ یہ قرآن کی محبت کا اعجاز تھا۔ ایک دن گورنمنٹ آف انڈیا کا برطانوی نژاد ہوم ممبر معائنہ کے لئے آ پہنچا میں بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ کہیئے شاہ جی! آپ اچھے ہیں" میں نے کہا خدا کا شکر ہے"

اُس نے دوبار پوچھا "کوئی سوال"

"میں صرف اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں" یہ میرا جواب تھا۔ وہ فوراً بولا۔ نہیں میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں۔ جی ہاں! آپ ہمارے ملک سے نکل جائیں۔

تاریخ اسلام کا مایہ ناز سپوت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

مولانا تاج محمود مرحوم

شاہ جی کی ذات گرامی بے شمار محاسن کا مجموعہ تھی۔ وہ نظر بہ ظاہر ایک انسان تھے۔ لیکن حقیقت میں قدرت نے انہیں کئی انسانوں کے کمالات و اوصاف سے نوازا تھا۔ وہ عشق رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے عالم بے مثال مفسر قرآن، فصیح اللسان مبلغ اسلام۔ بڑے دل گردے کے مجاہد، ہمہ تن ایثار، سراپا اخلاص۔ وجیہہ صورت۔ مضبوط ڈیل و ڈول۔ سرفروش غازی۔ سحر طراز مقرر۔ انقلاب انگیز خطیب۔ پرسوز قاری۔ باخدا مرد مومن اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔

ان کے خیالات میں آسمانوں کی بلندی۔ عقائد میں پہاڑوں کی پختگی زبان میں دریاؤں کی روانی۔ جلال میں تلواروں کی کاٹ اور جمال میں صبا کی لطافت پائی جاتی تھی۔ وہ نبی نہ تھے بلکہ ان کی زندگی حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی شہادت و اشاعت میں گزری کہ۔

"انا خاتم النبیین لا نبی بعدی"

لیکن شکل و صورت سے لے کر نشست و برخاست تک ہر بات میں پیغمبرانہ انداز رکھتے تھے۔ ان کے جس کمال اور جس خصوصیت پر غور کیا جائے حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا است

ہم نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا نہیں ان کے حالات سیرت و تاریخ کی کتابوں میں پڑھے ہیں۔ شاہ جی کی زندگی عبادت و ریاضت سے لے کر لطافت و ظرافت تک انہیں اکابر کی زندگیوں کا عکس جمیل تھی۔

اگرچہ فیاض ازل نے بڑی فیاضی سے انہیں بے شمار ملکات و صفات ودیعت فرمائے تھے لیکن ان کمالات میں جو چیز سب سے نمایاں تھی اور جس کی بدولت شاہ جی آسمان شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے وہ ان کی خطابت تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسب و نسب کی شرافت و نجابت سے لے کر آواز کی سحر طرازی الفاظ کی فصاحت و بلاغت تک کی تمام نعمتیں انہیں خطابت ہی کے لئے عطا کی گئی تھیں۔ لاکھوں کے مجمع میں جب تشریف لاتے تو لوگوں کی گردنیں اٹھنے لگتیں۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ مجمع سے منظم اور غیر منظم نعرے بلند ہونے شروع ہوتے۔ ایک ہی وقت میں ایک گوشہ اللہ اکبر پکار رہا ہوتا۔ دوسرا زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتا غرض مجمع میں ایک غلغلہ بپا ہو جاتا۔ بیٹھ جائیے بیٹھ جائیے، سٹیج سے آواز آتی حضرات بیٹھ جائیے اطمینان سے بیٹھ جائیے۔ شاہ جی ابھی اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں۔ آپ انہیں بخوبی دیکھ سکیں گے۔ ذرا بیٹھ جائیے۔ لیکن کون سنتا آدھے کھڑے آدھے بیٹھے ہیں۔ کھڑے ہونے والے بیٹھ رہے ہیں اور بیٹھے ہوئے

کھڑے ہو رہے ہیں۔ ایک عجیب وارفتگی اور شوق کا عالم ہوتا۔ شاہ جی بڑے عجیب و غریب انداز سے آتے، پنڈال نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھتا اور جب وہ اسٹیج پر پہنچ کر ستاروں میں چاند کی طرح بیٹھ جاتے تو لوگوں کا شور و غل اور جلسے کی افراتفری سکون و سکوت میں بدل جاتی، ہو

شاہ جی کی زندگی عبادت و ریاضت سے لیکر لطافت و ظرافت تک اکابر کی زندگیوں کا عکس جمیل تھی

کا عالم طاری ہو جاتا۔ اب شاہ جی مجمع کے سامنے آتے تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہتے کچھ پڑھ کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں اور ہتھیلی پر پھونکتے ہاتھ منہ پر پھیر لیتے۔ میرا زندگی بھر یقین رہا کہ جب شاہ جی مجمع کے سامنے کچھ پڑھ کر پھونکتے تھے تو آپ کے دل کا تعلق کسی اور ہی جگہ ہو جاتا تھا۔

سیماب لفظ لفظ اترتا ہے عرش سے

ایک دفعہ سامنے پھر دائیں بائیں سے مجمع کو دیکھتے۔ پھر خطبہ کی آیات اور درودِ پاک حجازی لے پڑھتے۔ عوام کے دل و دماغ مسحور ہو جاتے عناصر پر سکتہ طاری ہو جاتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ عالمِ ارواح اور عالمِ ملکوت بھی شاہ جی کی آواز پر متوجہ ہو گئے ہیں۔ تقریر شروع ہوتی، منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہاتھ اٹھاتے ہلاتے تو محسوس ہوتا کہ عوام پر جادو کر رہے ہیں۔ آیات احادیث کا ایک ذخیرہ اردو پنجابی کے شعر ایسے بر محل پڑھتے گویا انگشتری میں نگینے جڑ رہے ہیں۔ لطائف ظرائف بیان کرتے تو مجمع کشتِ زعفران بن جاتا۔ کبھی ہنسا دیتے کبھی رلا دیتے۔

رات ڈھل جاتی، سحر قریب ہو جاتی اور وہ پڑھ رہے ہوتے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

نہ کسی کو سردی گرمی کا احساس رہتا نہ کسی کو نیند و آرام کا خیال۔ اگر کسی کو کوئی فکر دامن گیر ہوتی تو صرف یہ کہ کہیں رات ختم ہونے کے ساتھ ہی شاہ جی کی تقریر ہی ختم نہ ہو جائے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ شاہ کی تقریر میں صبح کی اذان ہوئی اور شاہ جی چونک کر مؤذن کو پکار اٹھتے۔

تری آواز مکے اور مدینے

تب تقریر ختم کر دیتے۔ لوگ اصرار کرتے شاہ جی کچھ اور فرماتے بھائی رات ختم ہو گئی، اور شاہ جی عموماً اس شعر پر ختم کر دیتے۔

وسعت دل ہے بہت، وسعت صحرا کم ہے
اس لئے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے

شاہ جی کی تقریریں لوگوں کے دل و دماغ کو کیونکر مسخر کر لیا کرتی تھیں یہ ایک لمبی داستان ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ انہوں نے اپنی خطابت سے بڑے بڑے طوفانوں کو روکا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ صرف چند واقعات عرض کرتا ہوں جن سے اندازہ ہو گا کہ وہ کس طرح لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔

(۱) ایک ریٹائرڈ پولیس افسر نے بتایا کہ ایک مرتبہ شاہ جی مسجد خیر دین امرتسر میں تقریر کر رہے تھے۔ میں ڈیوٹی پر تھا۔ دو بجے شب مجھے اعلیٰ حکام نے طلب کیا اور میری جگہ ایک دوسرا رپورٹر بھیجا میں نے جب اپنی ڈائری ختم کی تو اس میں یہ الفاظ درج کر دئیے۔

"شاہ جی رات کے ۱۱ بجے سے تقریر کر رہے ہیں۔

سب رات کے دو بجے تک ان کی تقریر سے حاضرین جلسہ تو درکنار مسجد خیر دین کے در و دیوار اس کے گنبد، محراب در حوض کے پانی تک مسحور ہو چکے ہیں؟

(۲) خان غلام محمد خاں لونڈ خور نے سنایا کہ میں نے نہ تو شاہ جی کو دیکھا ہوا تھا اور نہ انکا خاص معتقد تھا۔ میرا سیاسی مسلک بھی ان سے جدا تھا۔ ایک دفعہ عشاء کے وقت دلی دروازہ کے باہر سے گزرا تو شاہ جی تقریر کر رہے تھے۔ میں بڑے ضروری کام میں تھا۔ اس خیال سے رک گیا کہ جس مقرر کی اتنی شہرت ہے اسے پانچ منٹ سن لو۔ میری عادت یہ ہے کہ میں جلسہ میں ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتا۔ خود اپنے جلسے بھی گھوم پھر کر دیکھتا اور سنتا ہوں۔ میں پانچ منٹ تک شاہ جی کی تقریر سنتا رہا پھر سوچا تھوڑی دیر اور سن لوں۔ ان کا سحر تھا کہ کھڑے کھڑے بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے ساری رات تقریر سنتا رہا اور ایسے حواس گم ہوئے کہ اپنا کام ہی بھول گیا۔ یہاں تک کہ صبح کی اذان بلند ہوئی شاہ جی نے تقریر کے خاتمے کا اعلان کیا تو مجھے خیال آیا کہ اوہو! ساری رات ختم ہو گئی یہ شخص تقریر نہیں کر رہا بلکہ جادو کر رہا تھا۔

(۳) حاجی قاسم دین لائل پور میں کپڑے کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین و دنیا دونوں بڑی فیاضی سے عطا کی ہیں۔ شاہ جی کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ تقسیم سے قبل آگرہ میں تھے انہوں نے واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ شاہ جی آگرہ میں مارکیٹ کی چھت پر منعقدہ جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔ حجازی لہجہ میں قرآن مجید کی آیات پڑھیں تو ایک نوجوان تڑپ کر چھت کے کنارے کی دیوار سے چھت پر آن گرا، مرنے سے تو بچ گیا لیکن وجد اور جذب کی حالت میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ لوگوں نے اٹھایا تو اس کے چھرا بر آمد ہوا، اسے شاہ جی کے پاس لایا گیا۔ شاہ جی نے اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا کچھ پڑھ کر پھونکا اور محبت سے پاس بٹھا لیا جب سے ہوش آیا تو اس نے انکشاف کیا کہ مجھے تو شاہ جی کے قتل کے لئے بھیجا گیا تھا۔ لیکن شاہ جی کا طرز قرآن مجید سن کر میں بے تاب اور بے ہوش ہو ... پھر اس کے بعد کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔

(۴) ایک دفعہ شاہ جی علی گڑھ کے کسی جلسہ میں تقریر کرنے تشریف لے گئے۔ کالج کے طلبہ نے تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ ایسا ہنگامہ بپا کیا کہ تقریر کرنا محال ہو گیا۔ شاہ جی نے دیکھا کہ بچے برا فروختہ ہیں۔ کوئی اور نصیحت کار گر نہیں ہوتی تو فرمایا۔ اچھا بیٹا قرآن مجید کا ایک رکوع پڑھ دیتا ہوں اور جلسہ تمہارے احترام میں ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ طلبہ خاموش بیٹھ گئے شاہ جی نے انتہائی دلسوزی سے نیم خورد آواز میں قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ چشم و گوش اور در و دیوار جھوم گئے۔ تلاوت ختم ہوئی تو فرمایا بیٹا کیا خیال ہے اس کا ترجمہ بھی کر دوں۔ آواز آئی ضرور ترجمہ بھی کر دیجئے۔ اب ترجمہ شروع ہوا پھر ترجمے کے تفسیر و تشریح کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ شاہ جی نے تقریر ختم کی طلبہ نے شور مچایا، شاہ جی خدا کے لئے کچھ اور بیان کیجئے۔ فرمایا بیٹا کبھی پھر آؤں گا تو تقریر سناؤں گا۔

شاہ جی ایک صاحب طرز خطیب تھے ان کی خطابت میں سیاست مذہب معاش اور معاشرت سبھی قسم کے مسائل زیر بحث آتے۔ لیکن ان کی خطابت کا مرکزی نقطہ جس کے گرد نہ صرف ان خطابت بلکہ انکی پوری زندگی گردش کرتی تھی وہ عشق رسول تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی کے کلی محاسن ان کی خطابت کے لئے تھے اور ان کی خطابت عشق رسول کےلئے تھی انہی کی ایک نعت شریف کا مطلع اور مقطع ہے۔

سبحان من یریٰ چہ شانِ محمد است
لولاک ذرہ زجہانِ محمد است
سرِ قضا وَ قدر ہمین است اے ندیم
پیکان امر حق زکمانِ محمد است

حضور سرور کائنات کے فضائل کو عشق و محبت میں ڈوب ڈوب کر بیان کرتے۔ حضور کے لئے الفاظ و القاب کا انتخاب خاص اہتمام سے کرتے تھے۔ اگر کوئی معیاری نعت آپ کے سامنے پڑھی جاتی تو اس کے الفاظ و آواز پر سر دھنتے تھے۔ ایک دفعہ لاہور میں ایک رضا کار نے نعت پڑھی سبحان اللہ سبحان اللہ پڑھتے ہوئے جھومنے لگے میری آنکھوں میں ابھی تک وہ نقشہ ہے۔ شاہ جی جذب و مستی کے عالم میں جھوم رہے تھے حتیٰ کہ ان کے گھنگریالے بالوں پر بھی اسی جذب و مستی سے "وجد" کی حالت طاری تھی۔ ایک شعر پر جس میں سرور دو عالم کے فقر و فاقہ اور سیدۃ النساء کی ردائے مبارکہ کی کہنگی کا ذکر تھا کھڑے ہو گئے، اور کھڑے کھڑے جھومتے رہے۔ جب وہ کیفیت ختم ہوئی تو فرمایا، کہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک پر قیام کرنے کا مقام تھا۔

انہوں نے اپنی خطابت سے بڑے بڑے طوفانوں کو روکا یہاں تک کہ بڑے بڑے معرکے سر کیئے

گجرات کے مشہور مقدمہ میں جب لدھا رام رپورٹر سی آئی ڈی نے حقیقت حال کا انکشاف عدالت عالیہ میں کیا اور شاہ جی کی رہائی ہو گئی تو لدھا رام سے پوچھا گیا کہ آخر تو نے سرکاری ملازم ہوتے ہوئے یہ جھوٹی شہادت دینے سے گریز کیوں کیا اور سچی شہادت سے اپنے آپ کو خطرے میں کیوں ڈالا۔ تو اس نے بتایا کہ میں نے سرکاری ملازمت میں ہمیشہ سچی جھوٹی شہادتیں دی ہیں اور اس دن بھی شاہ جی کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ ڈائری میں رد و بدل اگرچہ اعلیٰ حکام کے حکم سے کیا تھا لیکن اس میں بہر حال میری بھی رضامندی شامل تھی۔ ہوا یہ کہ میں جب گواہی دینے عدالت میں آیا تو شاہ جی کو دیکھا کہ ریشوں اور بھنوں کی شکل و صورت کا ایک سچا انسان کھڑا ہے۔ مجھے کسی مخفی طاقت نے ٹوکا کہ یہ شخص اب میری جھوٹی شہادت پر پھانسی کی سزا پائے گا۔ میرا دل لرز گیا میں نے دل ہی دل میں توبہ کی اور عہد کر لیا کہ دنیا کی ہر مصیبت برداشت کر لوں گا لیکن اس عظیم انسان کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کا پاپ نہیں کماؤں گا۔ تب میں نے شاہ جی کے وکیل کو علیحدگی میں سارا ماجرہ بیان کیا ساتھ ہی اپنا ارادہ بتایا۔ لدھا رام نے ہائیکورٹ میں شہادت دی اس کی ملازمت گئی، تین سال سخت کی سزا ہوئی لیکن شاہ جی کی معجزانہ رہائی کا باعث بن گیا۔

اس مقدمہ میں شاہ جی ۹ ماہ کے قریب جیل میں رہے جب رہا ہو کر آئے تو تقریروں میں اکثر فرمایا کرتے کہ ایک طرف میں بے نوا تھا میرے غریب ساتھی جیلوں میں مقید تھے۔ میری اولاد کمسن اور والد ضعیف العمر تھا۔ دوسری طرف فرنگی کی صولت و حشمت تھی۔ خزانے اس کے پولیس اس کی عدالتیں اس کی جیل خانے اس کے سب اختیار و اقتدار اسی کا تھا۔ پھر ترنم سے پڑھتے۔

روح بخت ملاقی ان کا
چرخ ہفت طبقاتی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

حضرت یوسف علیہ السلام کے زندانی ہونے کا واقعہ دہراتے، زلیخا کی الزام تراشیوں کا ذکر کرتے قرآن مجید کی آیت شریفہ وشھد شاہد من اھلھا پڑھ کر لدھا رام کو انگریزوں کا گھریلو گواہ قرار دیتے اس مقدمہ سے رہائی کو وہ اللہ کا عظیم احسان کہتے آخر میں فرماتے اے اللہ اس

نعمت کے شکرانے میں میں تیری خدمت میں کیا پیش کروں کیونکہ جو نعمت سوچتا ہوں وہ سب ترے خزانوں میں موجود ہے ایک دن تقریر کرتے کرتے جھولی پھیلادی اور فرمایا میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جو تیرے پاس نہیں ہے وہی تیرے شکر نعمت کے لئے پیش کرتا ہوں اور وہ میرے گناہ ہیں میرے پاس ان کے سوا کچھ نہیں پھر یہ بیان کچھ اس عجز و انکسار اور رقت انگیز منظر میں پیش کیا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔

> ایسا محسوس ہوتا کہ عالم ارواح اور عالم ملکوت بھی شاہ جی کی آواز پر متوجہ ہو گئے ہیں

شاہ جی نے تحریک آزادی میں جو تقاریر کیں اگر انہیں جمع کیا جائے تو وہ ایک بے مثال ذخیرہ ہے۔ قرآن مجید سے بعض ایسی آیات کا انتخاب فرمایا کرتے اور ان پر آزادی سے متعلق ایسی شعلہ بار تقریریں کرتے جنکو اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد انکی پوری توجہ مسئلہ تحفظ ختم نبوت کی طرف ہو گئی۔ وہ اس مسئلے کو توحید، رسالت، قیامت اور تمام عقائد و عبادات اسلام کی اصل قرار دیتے تھے ان کا استدلال یہ تھا کہ ان تمام مسائل کی تعریف اور تعین نبوت کرتی ہے اگر نبوت بدل سکتی ہے تو یہ سب کچھ بدل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ حلال و حرام بھی بدل سکتا ہے۔ وہ موجودہ اسلام کی بنیاد حضور سرور کائنات کی تعلیمات کو تعین کرتے تھے اور حضور کی ذات کے ساتھ انکا جو عشق تھا اس کے خلاف وہ کسی بھی [illegible] برداشت کرنے کا تصور تک بھی نہ کرسکتے تھے۔ مسئلہ ختم نبوت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جو کچھ کہا وہ برسوں

> اگر نبوت بدل سکتی ہے تو سب کچھ بدل سکتا ہے یہاں تک کہ حرام و حلال بھی۔

ہمارے ملک کی فضا میں گونجتا رہے گا۔ اس سلسلے میں وہ بعض عجیب عجیب پیشن گوئیاں بھی کرتے تھے جو وقت نے کچھ پوری کر دی ہیں اور وقت بعض دوسری باتوں کو بھی پورا کر دے گا۔ انشاء اللہ۔

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے سلسلہ میں ان کا اخلاص کس درجے کا تھا اس کا اندازہ ان کی ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کی تقریر سے ہوتا ہے۔ جو انہوں نے لاہور (بیرون دہلی دروازہ) میں کی تھی اس دن خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے اپنی ٹوپی اتار لی اور فرمایا، کوئی ہے جو میری یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین کے پاؤں پر رکھ دے اور انہیں میری طرف سے یقین دلا دے کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں اگر وہ محسن کائنات جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس اور عزت کا تحفظ کر دیں تو میں اپنی زندگی انکا خدمت گار رہوں گا حتی کہ ان کے گلے میں اگر سور بھی ہوں گے تو انہیں بھی چراتا رہوں گا۔" اس سے مجمع میں ایک کہرام مچ گیا۔

صحابہ کرام کے اکرام و احترام کو بھی جزو ایمان

جانتے تھے اور اصحاب رسول پر تنقید و تنقیص کو بربادیٔ ایمان یقین کرتے، لکھنؤ میں بعض خلفائے راشدین کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہنا جرم تھا شاہ جی نے برسر اجلاس اس قانون کی دھجیاں اڑا دیں۔ وہ صحابہ کرام ازواج مطہرات اور اہل بیتِ اطہار کے فضائل و محاسن پر گھنٹوں بولتے رہتے تھے۔

محمد الرسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم

اور اسی طرح

وطائفة من الذين معك

سے وہ اصحاب و ازواج رسول ﷺ کی معیت کے درجہ کو عام ایمان کے درجے سے افضل قرار دیتے تھے۔ وہ حدیث پاک

المرء مع من احب

کو صحابہ کے فضائل میں بیان کر کے سعدی شیرازی کے مشہور شعر پڑھا کرتے تھے۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا من ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

شاہ جی مختلف اصحاب رسول کے فضائل کے سلسلہ میں حضور کی نبوت کی صداقت کا دو صحابہ کبار کو بہترین گواہ قرار دیا کرتے۔ پہلے جناب حضرت عمر بن خطاب اور دوسرے حضرت خالد بن ولید کو۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی! اور ابوبکر صدیقؓ؟ فرمایا ان کی اس مقدمے میں سرکاری گواہ کی حیثیت تھی۔ وہ حضور کے

لوح و قلم کی دنیا

موت کو راہ میں ظلمات کا اندیشہ تھا
چھین کر لے گئی ایوانِ مشیت کا چراغ
اب وہاں مٹی کا اک ڈھیر سا ہو گا ساغر
سر جھکاتی تھی جہاں لوح و قلم کی دنیا
(ساغر صدیقی مرحوم)

پہلے ہی سے دوست تھے لیکن یہ دونوں بہادر دشمن اور سخت دشمن تھے لیکن نبوت کی صداقت کو یقین کر کے شرف ایمان حاصل کر گئے۔ وہ حدیث رسول کو نبوت کی مثل فرمایا کرتے اور کہتے کہ اب کچھ لوگ اس مثل ہی کو عنقا بود کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ شاہ جی کی ایک بڑی خوبی ان کی زندہ دلی اور لطافت و ظرافت تھی۔ وہ مصنوعی خاموشی اور یبوست کے خلاف تھے اللہ نے باغ و بہار طبیعت بخشی ہوئی تھی۔ جب کبھی اُن پر مصائب کا ہجوم ہوتا، ساتھیوں پر ظلم و تشدد کی یلغار ہو رہی ہوتی۔ تو رنج و ملال نہیں کرتے تھے بلکہ خوب ہنستے اور ہنساتے تھے۔ اس طرح وہ اپنا اور اپنے دیوانے سرفروش مجاہدوں کا غم غلط کرتے رہتے۔ انکی شعر و سخن کی محفلوں بذلہ سنجی و ظرافت کی مجلسوں میں بیٹھ کر ہر رنج اور ہر مصیبت بھول جایا کرتے تھے۔ انکے بیان کردہ لطائف و ظرائف کو اگر کوئی اکٹھا کر لے تو ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ جب پہلے پہل ان پر فالج کا حملہ ہوا تو ہم ملتان پہنچے اتفاق سے مولانا احمد علی صاحب بھی لاہور سے مزاج پرسی کے لئے تشریف لے آئے۔ اب شاہ جی نے فالج کے حملے کے واقعہ سنایا کہ صبح اچھا بھلا اٹھا وضو کرنے لگا تو ہاتھ نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ منہ میں پانی ڈالا تو اس نے بھی بغاوت اختیار کی۔ میں سمجھ گیا کہ فالج کا حملہ ہوا ہے اور

اب میں مرنے لگا ہوں۔ جلدی جلدی وضو کیا صبح کی نماز ادا کی اور زور زور پڑھا۔ اشہدان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ لا نبی بعدہ ولا رسول بعدہٗ اور یہ پڑھ کر چارپائی پر لیٹ گیا کہ اگر اب موت آ گئی تو انشاء اللہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر لیٹا رہا اور موت کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن موت نہ آئی اب اٹھا اندر گیا بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا مانگا تو رات کی ٹھنڈی کھچڑی کھالی۔ شاہ جی نے یہاں بات کو پھر دہرایا کہ فالج کا حملہ موت کا انتظار اس پر رات کی ٹھنڈی کھچڑی کھالی البتہ ایک غلطی ہو گئی جس کے لئے اللہ سے معافی مانگتا ہوں، آپ لوگ بھی معاف کر دینا وہ یہ کہ کھچڑی کے بعد گھڑیا کا ٹھنڈا پانی پینا بھول گیا۔ بس یہ کسر رہ گئی۔ شاہ جی یہ باتیں بڑے مزے مزے لے لے کر کرتے تھے اور میں سوچتا تھا کہ فالج کا حملہ ہے منہ پر لقوہ کا اثر ہے زبان میں لکنت آ چکی ہے لیکن اس ہولناک اور خوف ناک مرض میں بھی شاہ جی کی وہی زندہ دلی اور چٹکلے ہیں اللہ نے کیسی باغ و بہار طبیعت عطاء کی ہے کہ کسی مرحلے میں بھی یاس و ملال یا کسی پریشانی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ جب کسی ساتھی کو رنجیدہ خاطر یا ملول دیکھتے بس ایسی بات کہہ دیتے کہ وہ رنج و ملال سب بہہ جاتا۔ ایک دفعہ مولانا محمد علی جالندھری سندھ کے تبلیغی دورے سے واپس آئے سفر کی تھکان، طبیعت ناساز، گلا خراب، افسردہ حال شاہ جی کی خدمت میں آ پہنچے۔ شاہ جی خود بھی بیمار تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی۔ شاہ جی مولانا کا بے حد احترام کرتے تھے۔ پوچھا۔

"محمد علی کیا حال ہے؟"

مولانا نے جواب دیا۔

"شاہ جی سفر بہت تھا بیمار ہو گیا تقریریں کرنا پڑیں طبیعت سخت خراب ہو گئی اور گلا بھی خراب ہو گیا۔"

شاہ جی لیٹے ہوئے تھے اٹھ بیٹھے اور فرمایا۔

محمد علی خدا کا خوف کر تیرا گلا اب خراب ہو گیا یہ پہلے کون سا لحن داؤدی تھا جو اب خراب ہوا ہے۔۔۔۔"

حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ شاہ جی خود بھی ہنس دیئے مولانا کی ساری خرابیٔ طبیعت جاتی رہی چہرہ کھل گیا۔

یہ وہ سحر تو نہیں!

بھئی ہم تو اب عمر کے عہد آخر میں ہیں، بڑھاپا شروع ہو کر جوان ہو چکا ہے۔ بالوں میں سفیدی آ گئی ہے۔ سفر ایک تھا۔۔۔ منزلیں کئی۔۔۔ بعض مقامات پر رکنا پڑا، بعض جگہ ٹھہرنا پڑا، کچھ دیر ستائے، تلوؤں کو سہلایا۔ آبلوں اور کانٹوں میں معانقہ ہو چکا تو چلنے لگے، پھر چلتے ہی رہے۔ حتیٰ کہ ایک رات بیت گئی۔ دن چڑھا سورج نے شعاعوں کا چمن آراستہ کیا۔ غنچوں کا چہرا مسکرا اٹھا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو گردو پیش وہی رات کا سناٹا تھا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔

(حضرۃ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

شاہ جی بعض باتیں ایسی کہتے جو سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہوتیں۔

وہ عام طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں نصف صدی اس ملک کے چپے چپے پر پھرا ہوں، میری قوم کی نفسیات یہ ہے کہ یہ ڈنڈے والے کے آگے اور دولت والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔

سچ ہے موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آخر یہ عظیم انسان بھی رخصت ہو گیا۔

گماں مبر کہ نظیری چو تو بگذری جہاں گزار
ہزار شمع بکشتند وانجمن باقیست

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ضروری تصحیح

حافظ محمد امین احمد پوری

گزشتہ برس اگست ۱۹۹۳ء کے آخری پندرھواڑے میں میرا ایک مضمون "الاحرار" جلد نمبر ۲۳ شمارہ نمبر ۱۰ میں بعنوان حضرت "امیر شریعت اور احمد پور شرقیہ" شائع ہوا۔ میں نے جو کچھ اپنی دانست کے مطابق لکھا وہ اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن برادر محترم مرزا عبداللہ بیگ صاحب کے فرمان کے مطابق حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلی مرتبہ جب تشریف لائے تو آپ نے گرلز ہائی سکول جو اس وقت بوائز ہائی سکول تھا کہ برآمدہ میں سورۃ اخلاص پر تقریر فرمائی۔ اور دوسری مرتبہ آپ نے اسی ہائی سکول کی دیوار کے قریب جو اس وقت دکانوں کی جگہ شیشم کے درخت کے سایہ میں تقریر فرمائی۔

ٹبی ڈھکواں کے واقعہ میں بقول مرزا صاحب اتنا عرض ہے کہ حضرۃ صبح کے وقت تشریف لا چکے تھے اور ایک کمرہ میں تشریف فرما تھے ہم تین آدمی (مرزا عبداللہ بیگ، سید عبدالوہاب جیلانی مرحوم اور مولوی منظور احمد شاگرد حضرۃ مفتی واحد بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے کمرہ کا دروازہ کھولا اور السلام علیکم کہا حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ بڑے غصہ میں تھے فرمایا آ جاؤ۔ صبح سے بیٹھا ہوا ہوں کسی نے السلام علیکم نہیں کہا تم ہی پہلے آدمی ہو جنہوں نے السلام علیکم کہا ہے۔ جو بھی آتا ہے بسم لائیں کہتا ہے۔

پہلی "احرار تحفظ ختم نبوۃ کانفرنس" میں ایک اہم واقعہ مضمون میں رہ گیا تھا جو عزیزی ملک عطاء اللہ اعوان پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج بہاولپور نے یاد دلایا وہ یہ کہ

کانفرنس کے اختتام کے بعد دوسرے دن احمد پور شرقیہ کے بریلوی عقیدہ کے بزرگ سید مستن شاہ مرحوم ہمیں ملے انہوں نے فرمایا کہ جب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد سورۃ فاتحہ تلاوۃ فرمائی لاؤڈ سپیکر کی آواز میرے کانوں میں پہنچی تو بے قرار ہو کر بستر سے اٹھا اور سیدھا جلسہ گاہ میں چلا آیا۔ حضرۃ رحمۃ اللہ علیہ کی پوری تقریر سنی۔ واقعی یہ لوگ سچے اور پکے محبِ رسول ہیں۔ جو اُن لوگوں کے بارہ میں غلط باتیں منسوب کرتا ہے وہ بدبخت اور کوڑھ مغز ہے۔





"تلخیص

"حضرت آدم علیہ السلام سے پیغمبر آخر الزّمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی ایسا نبی نہیں آیا ہے جس نے اپنی تعلیمات میں جلا پیدا کرنے کے لئے اپنے دور کے کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیا ہو۔ لیکن نبی اور رسول براہ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ نبی کی اللہ تعالیٰ خود راہنمائی کرتے ہیں۔ انبیاء کرام بہادر بھی ہوتے ہیں اور معصوم بھی۔ آپ انبیاء علیہم السلام کے احوال پر نگاہ ڈالیئے جو نبی بھی دنیا میں تشریف لاتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں الہام الٰہی کی کڑکتی ہوئی بجلیاں ہوتی ہیں اور دوسرے ہاتھ میں تلوار وہ کاشانہ باطل پر برق بن کر گرتا ہے اس کے جلو میں سمندروں کا شور اور طوفانوں کا زور ہوتا ہے۔ اس کی رفتار فرماں رواؤں کا دل دھڑکا دیتی ہے۔ اس کی ایک للکار سے کائنات کا دل دہل جاتا ہے۔



۱۶ تا ۳۱ اگست ۱۹۹۴ء

مردِ حُر کی صداء

فیض محمد بی اے۔ خواہر زادہ مولانا ہزاروی مرحوم

خطبۂ مسنونہ کے بعد آپ نے فرمایا، مسلمانوں میرا وقت عمر اکثر گزر چکا اب تو بوڑھا ہو چکا ہوں۔ پہلے شوق ہوتا ہے پھر ذوق پھر عادت پھر مریض۔ میں تو اب مریض ہو چکا ہوں مجبور ہوں ورنہ وہ پہلا سرور کہاں اور وہ وقت کہاں۔ آپ نے فرمایا۔ بھائیو۔ وقت کی قدر کرو۔ اکثر چیزوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ مگر وقت کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ فرمایا۔

ایک مبلغ اسلام ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اپنے مذہب کے بارے میں کچھ بیان کروں۔ فرمایا۔

مذہب تین چیزوں پر مبنی ہے۔ عقیدہ عبادت، معاملہ، آپ نے عقیدہ کی تشریح فرماتے ہوئے فرمایا کہ عقیدہ عربی لفظ ہے عقیدہ عقد سے ہے آپ نے تولیہ کو گانٹھ دے کر مثال بیان فرمائی۔ عقیدہ دل میں ہوتا ہے فرمایا جب نوجوان بیٹے کا رشتہ کرنے والدین جاتے ہیں تو پہلے در پردہ بات ہوتی ہے کہ کسی کو پتہ نہ لگ جائے کیونکہ دیوار بھی کان رکھتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ رشتہ میں رکاوٹ پیدا ہو۔ بعینہ یہی حال عقیدہ کا ہے عقیدہ دل میں ہوتا ہے۔ عقیدہ مذہب کی جان ہے۔ ورنہ مذہب کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا حکیم سے پوچھ لو اگر ایک انسان مرض کوڑھ میں مبتلا ہے۔ اسے جتنے اچھے کھانے دیئے جائیں اسے اتنا ہی نقصان ہوتا ہے پس سمجھ لو اگر عقیدہ خراب ہے تو جتنی نیکیاں بھی کرتے جاؤ گے تمہارے دوزخ کے درجہ میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

معاملہ اور عبادت کا درجہ اس کے بعد ہے آپ نے قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کہ دو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں نے تم کو تمام عالم اسلام کے لئے نبی بنا کر بھیجا ہے۔

حضرت انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کشمیری کا قول یاد کرایا کہ اگر کوئی قوم مریخ ستارہ میں بھی نکل آئے اس کے لئے بھی یہی قانون ہو گا اور یہی کتاب محکم ہو گی۔

آپ نے فرمایا کہ کتاب ہی نہیں بلکہ یہ کلام خداوندی ہے خدا کے اندر سے نکلا ہوا کلام ہے جیسے میں باتیں کر رہا ہوں۔ تو میرے اندر سے یہ باتیں نکل رہی ہیں۔ فرمایا ہماری باتیں فناہ ہیں لیکن کلام خداوندی باقی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھنے سے اتنا لطف نہیں آتا جتنا لطف مزید اس وقت آتا ہے۔ جب ہم کتاب اللہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھیں جس پر کتاب نازل کی گئی۔ اس پر آپ نے عام کتابوں کی مثال دی۔ اگر آپ کتاب پڑھیں۔ تو اپنے خیال کے مطابق سمجھیں گے مگر انتہا تک اس وقت پہنچو گے جب آپ اس کو کتاب والے سے پڑھو گے تب جا کر کہیں ٹھکانے لگو گے ورنہ گمراہی ہے۔ تلاوت آیات کے بعد فرمایا۔ کہ اے انسانو۔ یہاں کہیں ہو زمین کے نیچے ہو، اوپر

ہو ستاروں میں ہو۔ چاند میں ہو سورج اور دریا سمندر میں ہو جہاں ہو جیسے ہو تیسے ہو، عیاں ہو نہاں ہو۔ غرض سب کے لئے یہ قانون ہے۔ قرآن پاک اللہ کا کلام بس دین مکمل ہو گیا۔

تمام انبیاء کو اسی قرآن سے تھوڑا تھوڑا سا حصہ ملتا رہا اور تھوڑا تھوڑا کورس حالات کے مطابق دیا جاتا۔ اور آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نبی پر پورے کا پورا کورس اتار دیا۔ اب قیامت تک کسی دین کو ضرورت نہیں۔ تورات انجیل میں بتایا گیا ہے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیج رہا ہوں۔ پوری ایک سو آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور دین کامل ہو چکا ہے۔ اب کسی نئے دین کی ضرورت نہیں۔

اب نیا نبی آئے گا تو کرے گا کیا اور وہ کونسا قانون لائے گا۔

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ
پر کوئی اتنا تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا؟

ارے للہٰ بشیر الدین محمود مرزا کو میرے پاس میں احترام سے اسے اپنے پاس بٹھاؤں گا۔ باہر تو نکلو، تبلیغ اسے نہیں کہتے تبلیغ تو اسے کہتے ہیں کہ اب میں گاڑی سے اکیلا آیا ہوں اور کھلم کھلا اعلان کرتا ہوں۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ تمہارے باڈی گارڈ ہوتے ہیں اور تمہارا ڈیفنس کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ نبوت کھیل تماشا نہیں یہ وہ کان نہیں ہے جو ہر ایک کھول لیتا ہے۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے جس کو چاہیں عطاء کر دیں۔ نبی پرائمری لیل اور مل پاس نہیں ہوتا نبی یونیورسٹی سے نہیں نکلا کرتے۔ نبی اُمی ہوتے ہیں نبی کا استاد دنیا میں نہیں ہوتا۔ کائنات کی ساری وسعتیں نبی کے قدموں میں ہوتی ہیں۔ اگر حیوان اپنی ساری طاقتوں کے باوجود انسان نہیں بن سکتا تو انسان اپنی ساری خوبیوں کے باوجود پیغمبر نہیں ہو سکتا۔
آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک سب نبی اُمی تھے۔ نبی صرف خدا کی شاگردی کرتا ہے۔ وہ کائنات کی شاگردی سے بالکل مبرا ہوتا ہے۔ آپ نے سیلمہ کذاب شلجاح کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

اس عورت کی دلیل تو اتنی ٹھوس تھی۔ کہ جب لوگوں نے اس سے کہا کہ مردوں میں سے تو کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اس نے کہا ہاں یہ میں مانتی ہوں مگر تم یہ تو مان لو گے کہ میرے بعد اب کوئی نبیہ نہیں آئے گی۔ مگر عملی پہلو سے وہ مسیلمہ کذاب کے دام فریب میں آچکی ہیں۔ اور عقد کر لیا تھا۔ مہر بھی نہ کیا تین یا چار دن مسیلمہ

قرآن مجید سے متعلق شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ میں قرآن مجید کے سوا کسی دوسری کتاب کے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں جو کچھ ہے قرآن و سُنّت میں ہے۔ اور جو کچھ اس کے باہر ہے وہ باطل ہے۔ اور ایک باطل کے مطالعہ کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر آج دنیا قرآن چھوڑ کر دوسری کتابوں کی طرف نگاہ کر سکتی ہے تو میں کیوں نہ دوسری کتابوں سے رو گردانی اور اپنی تمام تر توجہ قرآن پر مرتکز کروں۔ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں۔ میری باتوں میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی وجہ سے ہے۔ جو چیز مجھے قرآن سے الگ کر دے اسے آگ لگا دوں۔"

کے ساتھ رہنے کے بعد معاً شجاع کو خیال آیا، اور وہ میں نے تو اپنا حق مہر بھی نہ بند ھوایا۔ اس پر مسیلمہ کذاب نے کہا۔ کہ کوئی بات نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو جو پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے اس میں سے میں نے تین نمازیں تیری امت کو معاف کر دیں چنانچہ شاہ صاحب نے فرمایا کہ آجکل جو لوگ دو نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہ اسی کی امت میں سے ہیں۔

میر ا بابا نے (مولانا عبید اللہ سندھی) سٹالن کے پاس قرآن پیش کیا وہ مان گیا۔ کہ ہاں آپ کا قرآن بدی کا بدلہ نیکی سے دیتا ہے لیکن ہمارے ہاں بدی کا بدلہ بدی سے دیا جاتا ہے۔ افسوس اب ہم قدم اٹھا چکے۔ اگر آپ پہلے مجھے ملے ہوتے اور میں نے کتاب اللہ کو دیکھا ہوتا تو واقعی اپنے منشور میں اسی کو شامل کر لیتا۔

فرمایا! دنیا تو قرآن کی طرف آ رہی ہے۔ اور مسلمان تم قرآن کو چھوڑتے جاتے ہو۔ فرمایا! روٹی کا مسئلہ تو ایک جاہل پٹھان نے بھی حل کر دیا ہے۔ یعنی روٹی دو ورنہ تم کافر ہو۔

آخر میں آپ نے مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ آپ نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا ہے اور ہم نے مرزائیت کو اسمبلی میں فیل کر دیا۔ چونکہ آئینی نبی ہے ہم اس کا آئینی طور پر ہی خاتمہ کریں گے۔

☆☆☆☆☆

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد ملک متوقع حالات سے دو چار ہوا۔ محلاتی سازشیں ارباب اقتدار کی ہوسناکیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اقتدار کی اس جنگ میں تھپڑوں اور کرسیوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ گویا ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا کہ ان ہی ایام میں شاہ جی نے لاہور کے ایک جلسہ سے خطاب کے دوران فرمایا۔

"معمار کا کام عمارت بنا دینا ہے۔ عمارت بنانے کے بعد وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ پھر اس عمارت میں بسنے والوں پر اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھو کہ معماروں نے گھر بنایا عمارت کھڑی کر دی۔ کچھ دروازے اور الماریاں باقی تھیں۔ لپائی بھی ادھوری تھی کہ اتنے میں ہنگامہ برپا ہو گا۔ کہ جلدی کرو جلدی کرو۔ مکان خالی کرو بیگمات آ گئیں۔ معماروں نے جلدی سے اوزار، ہتھیار سنبھالے اور اپنی راہ لی بیگمات عمارت میں گھس تو گئیں مگر کمروں اور الماریوں اور دوسری ضروریات کی تقسیم میں گتھم گتھا ہو گئیں۔ ایک دوسرے کے بال نوچنے لگیں وہ شور برپا ہوا کہ خدا کی پناہ یہی حال ہمارے ملک کا ہے۔ ہم نے انگریزوں کو نکالا۔ اہل ملک کے لئے عمارت کھڑی کی۔ ہم نے بنگلوں میں نہیں رہنا تھا ہم تو معمار کی طرح قوم کے مزدور تھے مگر بیگمات نے آنے میں جلدی کی ورنہ یوں جوتیوں میں دال نہ بٹتی۔

حاملِ سُنّت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

مقبول انور داؤدی

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء شاہ اللہ بخاری مرحوم و مغفور کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اگر برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کا جائزہ لیا جائے تو حضرت شاہ صاحب مرحوم کا نام نامی اور اسم گرامی آسمان سیاست پر چمکتا اور دمکتا نظر آتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سارے برصغیر اور خصوصیت سے سابق پنجاب کے عوام میں روح آزادی کو جاری و ساری کرنے کا کام جتنا شاہ صاحب نے کیا ہے کوئی دوسرا مقامی سیاسی لیڈر ان کے پاسنگ نظر نہیں آتا۔

عوام میں موافق ہو یا مخالف جو عزت، شہرت اور عظمت شاہ صاحب کو نصیب ہوئی۔ وہ کم سیاسی زعماء کو ملی یہ شاہ صاحب کا کمال تھا کہ سامعین گالیاں کھاتے بھی بے مزہ نہ ہوتے تھے اور حسن تقریر کا یہ عالم کہ عشاء کی نماز کے بعد شروع کرتے تو صبح کی نماز کے وقت ختم ہوتی۔ اور وہ اس لئے کہ صبح کی نماز پڑھنی ہوتی تھی۔ اور جلسہ گاہ میں عوام کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ جیسے ان پر جادو کر دیا گیا ہو ہزاروں نہیں لاکھوں کا مجمع یوں ساکت صامت ہوتا جیسے پتھر کے لاکھوں بت جلسہ گاہ میں نصب کر دیئے گئے ہوں۔

مجھے ذاتی طور پر شاہ صاحب سے بہت ہی کم شرف نیاز حاصل ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور کانگرس سے الگ ہو گئے۔ اور انہوں نے مسلم کانفرنس کی داغ بیل ڈالی۔ نہرو رپورٹ میں واضح طور پر برصغیر ہندوستان پر ہندو راج قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ ہندوؤں کا خیال تھا۔ کہ مسلمان آزادی کے دلدادہ ہیں وہ حصول آزادی کے شوق میں ہندوؤں کی غلامی کو بخوشی قبول کر لیں گے۔ مگر مسلم زعماء نے عین وقت پر ہندو لیڈروں کے دلی ارادوں کو بھانپ لیا اور وہ کانگرس سے الگ ہو گئے۔ مگر احرار بطور جماعت کانگرس کے ساتھ وابستہ رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کا ایک طبقہ باوجود احراری زعماء کی شاندار ملکی خدمات کے ان سے بدظن ہو گیا۔ ان میں میں بھی تھا۔ ہندو سے نفرت کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی۔ کہ انہوں نے مسلمانوں سے نفرت کرنا شروع کر دی شدھی کا جھگڑا شروع کیا۔ ہندو کو لڑاکا بنانے کے لئے ہر شہر میں اکھاڑے قائم کئے اور پھر ہندو مسلم فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو اس ہندو ذہنیت کا مظہر تھا۔ کہ مسلمانوں کو دبا کر سارے برصغیر میں ہندو راج قائم کیا جائے۔

زعمائے احرار کا مطمح نظر یہ تھا اور یہ ان کے خلوص کی دلیل تھی۔ کہ انگریز ہمارا مشترکہ دشمن ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس سے نپٹنا چاہیئے وہ تو شاید اس پر بھی راضی تھے کہ انگریز یہاں سے نکل جائے خواہ حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہی کیوں نہ چلی جائے لیکن قوم کے ایک طبقہ کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ وہ اپنی حیثیت کو بہر صورت زندہ رکھنے کا خواہش مند تھا۔

یہ ایک پس منظر ہے۔ جس نے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھے شاہ جی سے دور رکھا لیکن کبھی کبھی ان کی خدمت میں شرف باریابی بھی نصیب ہو جاتی ان میں سے ایک دن کی بات جو اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے عرض کرتا ہوں۔

حضرت شاہ محمد غوث کی مسجد کے سامنے مجلس احرار کا ملحقہ دفتر تھا۔ حضرت شاہ صاحب وہاں مقیم تھے میں اور سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے حسن تقدیر اہل مجلس محظوظ ہو رہے تھے شاہ جی کے لطائف و ظرافت کبھی کبھی مجلس کو کشت زعفران بنا دیتے۔

یکایک بات کا رخ پلٹا اور مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری پر بات چل نکلی بہت سے لوگوں نے اس میں حصہ لیا یکایک شاہ جی نے اپنے زانو پر ہاتھ مارا اور فرمانے لگے۔ او یارو! افضل حق چودھری نے جو بات کہ دی ہے اس نے میری آنکھوں سے اقتصادیات کے سارے پردے اٹھا دیئے ہیں۔ چودھری فضل حق نے کیا بات کہ دی جس کی طرف چودہ سو سال سے کسی مسلمان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ واہ چودھری تو نے کیا بات کہ دی۔ اور میں تو اس بات کو یاد کر کے اکثر روتا رہتا ہوں۔

اس وقت شاہ جی پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو رہی تھی سب سامعین شاہ جی کی بات سننے کے لئے سراپا گوش بنے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے فرمایا۔ چودھری نے ایک ایسی سنت کی طرف مجھے متوجہ کیا ہے جو ہمارے ذہن تک میں نہ تھی۔

سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے پر مسلمان اپنی نجات خیال کرتا ہے اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر کوئی بات نہ ہو۔ لیکن جو سنت چودھری نے بتائی اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی کسی نے اس کے متعلق سوچا تک نہیں۔

سنت کیا ہے؟ چودھری نے کہا شاہ جی آپ یہ تو بتایئے کہ جب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو حضور کے گھر میں کیا تھا؟ گھر میں کیا تھا میں چونکا اور کہا حضور کے گھر میں کیا ہوتا حضور نے فرمایا اگر میرے

دار العلوم نعمانیہ ڈیرہ اسماعیل خاں کے جلسہ پر شاہ جی تشریف لائے ہوئے تھے۔ دوران گفتگو فرمایا۔

"ایک ہے قوم کی نمائندگی اور وہ بہت سہل ہے۔ قوم جو چاہے جدھر جانے اسی طرف لے چلو۔ تم آگے ہو جاؤ۔ یہ نہ دیکھو کہ خیر کی طرف جا رہی ہے یا شر کی طرف وہ تمہارے پیچھے ہو جائے گی۔ اور زندہ باد کے نعرے ہوں گے۔ یہ بہت آسان ہے مگر خیانت ہے۔ اور ایک ہے قوم کی راہنمائی جس طرف خیر ہو اور قوم کا منہ شر سے ہٹا کر اس طرف پھیرنا بہت مشکل کام ہے اس میں مردہ باد کے نعرے بھی سننے پڑتے ہیں کیونکہ اس میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے اور اگر قوم شر کی طرف جا رہی ہے تو وہاں سے ہٹا کر خیر کی طرف موڑنا ہے ہم لوگ راہنمائی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے مخالفت بھی جھیلنی پڑتی ہے۔"

پاس احد کے پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا تو اس وقت تک مسجد نبوی سے نہ اٹھتا جب تک اس کا ریزہ ریزہ مسلمانوں میں تقسیم نہ کر دیتا۔

چودھری نے کہا۔ شاہ جی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر کوئی عمل کرتا ہے۔ کہ جب وہ مرے تو حضور کی سنت میں اس کے گھر میں کچھ نہ ہو۔

شاہ جی فرمانے لگے چودھری کی اس بات نے مجھ پر وجدانی کیفیت طاری کر دی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شاہ جی نے اس کے بعد اس سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری پوری طرح عمل کیا۔ امرتسر میں ان کا ایک عمدہ مکان تھا۔ لیکن مکان الاٹ نہ کرایا اور کرائے کے مکان میں زندگی بسر کر دی اور واقعی جب شاہ جی کا انتقال ہوا تو ان کے گھر میں کچھ نہ تھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ایک دوست کا کہنا ہے کہ امیر شریعت تقریر کے سلسلہ میں ایک دفعہ تشریف لائے تو میرے ہاں قیام فرمایا اور پوچھنے لگے کہ کتنے بچے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ ابھی تک بے اولاد ہوں۔ آپ نے اسی وقت ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی اللہ کے فضل سے شاہ جی کی دعاء نے شرف قبولیت اختیار کی اور ڈیڑھ سال بعد میرے ہاں پہلا لڑکا مسعود الرحمٰن تولد ہوا۔ جب دوبارہ شاہ جی ۱۹۵۸ء میں ٹھٹھی سیداں سے واپس ہوئے تو بندہ نے اپنے مکان پر ٹھہرایا اور مسعود الرحمٰن کو پیش کیا کہ یہ جناب کا مرید ہے۔ شاہ جی نے نام پوچھا تو میں نے ازراہ تفنن بتایا کہ نام مختصر ہے۔ مسعود الرحمٰن وُلِدَ فی شہر رمضان فی ملک پاکستان۔

شاہ جی نے مسکرا کر فرمایا ابھی نام چھوٹا ہے۔ سورۃ الرحمٰن ساری ساتھ لگا لو تو بہتر ہے اس پر محفل کشت زعفران بن گئی۔

جھوٹ سے نفرت

شاہ جی کو جھوٹ سے از حد نفرت تھی۔ وہ رفاقت میں اور ارد گرد ہر قسم کے لوگوں کو دیکھ سکتے تھے۔ اور کئی خامیوں کے باوجود بھی برداشت کرتے تھے لیکن جھوٹے آدمی کو ایک سیکنڈ بھی برداشت نہ کر پاتے۔ اور کہا کرتے کہ "جھوٹ سے میرے دل و دماغ کی دنیا تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔" خود جب آپ سے یا جماعت احرار سے متعلق جھوٹ و افترا کی داستانیں گھڑی جاتی تھیں تو آپ اپنی تقریروں میں اس کی تردید کرتے۔ اور گرج کر فرماتے تھے لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔



عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

شاہ جی خیر المدارس جالندھر کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے کہ ایک بھنگی صفائی کے لئے آیا۔ آپ اس وقت کھانا تناول فرما رہے تھے بھنگی کو بلایا اور اس کے ہاتھ دھلائے پھر اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا دیا۔ اور اسے کہنے لگے کہ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔" اس غریب پر کپکپی طاری ہو گئی۔ تھر تھر کانپنے لگا۔ اور پیچھے سرکتے ہوئے عرض کی۔ "حضرت میں چوڑھا ہوں۔" شاہ جی نے محبت سے فرمایا" تو کیا چوڑھا انسان نہیں ہوتا۔؟" بھائی تم میری طرح انسان ہو۔ آؤ مل کر کھانا کھائیں۔" یہ فرما کر آپ نے ایک پانی کا گلاس اس بھنگی کی طرف بڑھاتے ہوئے حکم دیا کہ لو پیو" اس نے دو چار گھونٹ پیئے۔ آپ نے اس کا بچا ہوا پانی خود نوش فرمالیا۔ اب بھنگی کا احساس بیدار ہو چکا تھا۔ اور وہ احساس کمتری جو ورثہ سے چلا آرہا تھا اس کا طلسم باطل ایک سیّد کے ہاتھوں ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے اندر تبدیلی محسوس کی اور شاہ جی کے ساتھ کھانے میں مصروف ہو گیا۔

شاہ جی کا اخلاص اور للّٰہیت کام کر گئی۔ بھنگی کی کائنات میں زلزلہ آگیا اُس کی زندگی بدل گئی ایک سید نے اپنے کردار سے اسے روشن موڑ عطا کر دیا۔

چنانچہ وہ اسی خوشی میں گھر جاتا ہے۔ اور اپنی بیوی کو یہ واقعہ سنا ڈالتا ہے۔ بیوی بھی خوشی سے پھولی نہ سمائی اور کہنے لگی کہ جس دین کے ماننے والوں کا یہ حسن کردار ہے۔ اس کو کیوں نہ قبول کر لیا جائے شام کو وہی نوجوان جو نسلی عیسائی تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ بخاری کی قیام گاہ پر حاضر ہوا اور ہاتھ باندھ کر عرض کی شاہ جی یہ میری بیوی ہے اللہ کے لئے ہم دونوں کو کلمہ پڑھا کر دائرہ اسلام میں داخل فرمالیجئے۔" دوسرے ہی لمحہ یہ خوش قسمت جوڑا اسلام کی نعمت سے سرفراز ہو چکا تھا۔ اور محمد ﷺ ماننے والوں میں دو انسانوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

جنہوں نے کشمیریوں میں آزادی کی روح پھونکی

حکیم مختار احمد الحسینی

وادیٔ کشمیر میں ڈوگرہ سامراج مسلمانوں پر جبرو تشدد اور جورو ستم کے پہاڑ توڑ رہا تھا اور خون مسلم سے وادی کے ذرہ ذرہ کو رنگین بنا چکا تھا۔ اور ادھر شاطر فرنگی کشمیر کو قادیانی سٹیٹ بنانے کے منصوبے بنانے میں مصروف تھا۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے خواجہ کمال الدین لاہوری مرزائی کے بھائی خواجہ جمال الدین جو ان دنوں ریاست میں انسپکٹر تعلیمات تھا۔ اس کے اثر و رسوخ اور منصب سے فائدہ اٹھا کر تمام تعلیمی اداروں میں لاہوری اور قادیانی مرزائی بھرتی کر لئے گئے مزید برآں ۲۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں انگریز کے ایماء پر سرکاری اور درباری لوگوں کا اجتماع ہوا جس میں کشمیر کمیٹی کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ مرتبہ پروگرام کے مطابق مرزا بشیرالدین محمود آنجہانی (خلیفہ قادیاں) کو صدر اور مسٹر عبدالرحیم خلیفہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کو جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ شملہ ہی سے مرزا بشیر الدین نے ایک اعلان کے ذریعہ کہا کہ مجھے تمام مسلمانوں نے اپنا راہنما تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب آنجہانی نے ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو تمام ہندوستان میں یوم کشمیر منانے کا اعلان کر دیا۔ خلیفہ کے پرائیویٹ سیکرٹری نے ملک کے مشہور لوگوں کو خطوط لکھ کر اطلاع دی کہ انہیں کشمیر کمیٹی کا ممبر بنا لیا گیا ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمان فرنگی کی اس سیاسی سازش سے بے خبر تھے۔ چنانچہ مجلس احرار کے عظیم دماغوں نے فوراً انگریز کی سیاسی سازش کو تاڑ لیا۔

تحریک آزادیٔ کشمیر اور احرار

آخر مجلس احرار نے مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور احرار کے پلیٹ فارم سے تمام سیاسی جماعتوں کو دعوت دی کہ ہم سب کو مل کر کشمیر کے سیاسی مسئلہ کا حل کرنا چاہیے۔ ورنہ کشمیر کمیٹی ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کو اور خطرناک بنا دے گی۔

امیر شریعت جنہوں نے کشمیر میں آزادی کی روح پھونکی

احرار کا اس میدان میں آنا تھا کہ فرنگی سازش ناکام ہو کر رہ گئی۔ کشمیر کمیٹی کے تار پود بکھر گئے۔ اور علامہ اقبال نے نائب صدارت سے استعفاء دے دیا۔۔۔۔

دوبارہ سرکردہ مسلمانوں نے جو کمیٹی تشکیل دی اس کے صدر علامہ اقبال چنے گئے۔

کشمیر چلو کی تحریک

مجلس احرار اسلام میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے اور قابل ترین افراد موجود تھے۔ تاہم طاقت کا اصل

> سر فضل حسین نے ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا قصہ کھڑا کر کے احرار سے دل کھول کر انتقام لیا۔

سرچشمہ شاہ جی کی ذات تھی۔ شاہ جی نے اپنی ساحرانہ خطابت اور مجاہدانہ عزم سے ڈوگرہ سامراج کے خلاف صور پھونکا اور کشمیر چلو کی صدا بلند کی۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے اس آواز پر لبیک کہا گیا۔ فرزندان توحید نے سر بکف ہو کر کشمیر کی سرحدات میں داخل ہونا شروع کر دیا۔ شہادت، قید و بند اور مار پیٹ کے مصائب و آلام کے طوفان سے کھیلنے لگے۔ لیکن یہ سختیاں ان کے مجاہدانہ عزم اور شوقِ شہادت و آزادی کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ بلکہ ذوق و شوق بڑھتا گیا۔ چالیس ہزار مجاہدوں نے کشمیر کی آزادی کی خاطر جیلوں کو بھر دیا۔ یوں تو اس جہاد میں پورے ملک نے حصہ لیا لیکن تنہا سیالکوٹ کے دس ہزار فرزندان اسلام نے قربانی پیش کی۔ شاہ جی کے رفیق کار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو دراصل امیر احرار تھے۔ ہندوستان بھر کے اخبارات کی فہرست بنا کر رابطہ قائم کیا نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ کشمیر مشترکہ مسئلہ بن

> مجلس احرار اسلام میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے اور قابل ترین افراد موجود تھے

گیا۔ اور مدراس تک کے جیالے رضا کاروں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔

مہاراجہ کشمیر نے شکست تسلیم کرلی

شہیدوں کا خون رنگ لاتا ہے۔ تو نوجوانوں کی قربانیوں سے قومی اور ملی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں اور ان کے مقدس خون کے جہاں چھینٹے پڑتے ہیں وہاں آزادی کے تن آور درخت پیدا ہوتے ہیں۔ مہاراجہ کو سرفروشوں کے عزم کے آگے جھکنا پڑا۔ اور اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور خود اختیاری کی اساس پر کشمیر میں جمہوری حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اسمبلی کے قیام کی تجویز کی گئی۔

اس وقت اگر کشمیری لیڈر عجلت پسندی سے کام نہ لیتے نرخ بالا کن آرزانی ہنوز کے فارمولا پر عمل پیرا ہوتے اور مفکر ایشیا چودھری افضل حق مرحوم کی اس تجویز پر اڑ جاتے کہ ہم ذمہ دار نمائندہ حکومت سے کم پر کسی طرح راضی نہ ہوں گے تو حالات مختلف ہوتے۔ اور مہاراجہ کی اپنی حیثیت باقی نہ رہتی۔ کہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا اعلان کرنے کی جرأت کر سکتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

تحریک کے گہرے اثرات

تحریک سے پہلے عوام میں یہ تأثر پایا جاتا تھا کہ

کشمیری مسلمان بزدل ہیں۔ ان میں صلابت اور استقامت اور شجاعت و بسالت عنقاء ہے اس موقع پر پہلی بار اس

شاہ جی نے اپنی ساحرانہ خطابت اور مجاہدانہ عزم سے ڈوگرہ سامراج کے خلاف صور پھونکا۔ اور کشمیر چلو کی صدا بلند کی۔

نظریہ کے تار پود بکھر گئے اور کشمیری مسلمانوں نے اس کا جواب اپنے عمل سے دیا۔ اور میرواعظ یوسف کی پکار پر پروانہ وار گولیاں کھاتے تھے۔ اس تحریک کا دوسرا اثر یہ پڑا۔ کہ کشمیریوں میں آزادی کی لہر دوڑ گئی جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہیں۔

تیسرا گہرا اثر یہ ہوا کہ فرنگی اور قادیانیوں کی سازش تباہ کر کے رکھ دی گئی۔ اور کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کا تصور ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر رہ گیا۔

گو بعد میں اس تحریک کی قیمت مجلس احرار کو بھاری ادا کرنی پڑی۔ اور سر فضل حسین نے ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا قصہ کھڑا کر کے احرار سے دل کھول کر انتقام لیا۔

تھوڑے دنوں تک مغرب کی گھناؤنی تصویر یہاں بھی نظر آنے لگے گی۔

میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر میں قبل اس کے یہ ملک بیسویں صدی کے سیلاب کی نذر ہو جائے۔ افغانوں کا سال نواسی وادی میں گزاروں"

☆☆☆

تفنن

شاہ جی بیٹھک میں بیٹھے پان لگا رہے تھے کہ کسی نے سوال کیا۔

"شاہ جی! اگر میری حکومت ہو تو پان سگریٹ پر پابندی عائد کر دوں"

شاہ جی نے شفقت و محبت بھری نظروں سے اُن صاحب کو دیکھا اور فرمانے لگے بیٹا آپ نے بھی کر لی حکومت۔" اور پھر ایک واقعہ سنا ڈالا۔ کہ احرار کے عالم شباب میں ایک بہت بڑے اجتماع سے میں مخاطب تھا اور احرار کے پروگرام کو پیش کر رہا تھا کہ اگر احرار کی حکومت ہوئی تو چکلے بند اور فاشی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ شرابی، زانی اور چور وغیرہ کو شرعی سزائیں ملیں گی۔ جلسہ میں ایک بوڑھا جو میری تقریر پوری دلجمعی اور ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا۔ فوراً بول اٹھا۔ "ہاں شاہ جی! پھر آپ نے حکومت کر لی۔"

باتیں شاہ جی کی



میں نے جو کچھ کیا اللہ اور اس کے رسول کے لئے کیا۔ مجھے ایک لحظہ کے لئے بھی اپنی کسی حرکت پر ندامت نہیں میرا دماغ غلطی کر سکتا ہے لیکن میرے دل نے کبھی غلطی نہیں کی۔ مجھ سے زیادہ وفاداری کا ثبوت مانگنے والے پہلے اللہ اور اسکے رسول کو وفاداری کا ثبوت دیں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں جو انسانی ضمیر کی سوداگری کرتے ہیں، میں اُس شخص کو دھوپ چھاؤں کی اولاد سمجھتا ہوں۔ جو ملک کو بیچتا پھرتا ملک سے غداری کرتا اور جس ہنڈیا میں کھاتا ہے اسی میں چھید ڈالتا ہے۔ میں نے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکنا سیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کا وارث نہیں جنھوں نے درباروں کی دہلیزیں چاٹی ہیں۔ میں انکا وارث ہوں جو شہادت کے رستہ میں سروں کو ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں جو یہ صدا دیتے پھریں۔ کہ میں توشۂ وفا داری لئے پھرتا ہوں۔ میری انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو، اور جس مقتل میں چاہو مجھے ذبح کر دو۔

آفتاب خطابت

عبداللہ ملک

بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے

یہ دلفریب موسم تھا، سورج کی کرنوں کی چبھن کم ہو رہی تھی شاموں کا حسن نکھر رہا تھا، ان ملگجی شاموں کو باغوں اور پارکوں میں ہجوم بڑھنے لگا تھا، سبزہ پھوٹ رہا تھا، ہریالی آ رہی تھی ٹنڈمنڈ درختوں پر پتے پھر سے نمودار ہو رہے تھے۔ باغوں اور میدانوں میں خوشبوئیں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں۔ مجھے آج ایک ایسے ہی موسم اور ایسے ہی دنوں کی بات کرنی ہے۔

آج بھی یہ موسم آتا ہے، آج بھی کونپلیں پھوٹتی ہیں، ہریالی آتی ہے۔ آج باغوں اور پارکوں میں سرشام لوگوں کے ہجوم جمع ہوتے ہیں تاکہ وہ اس حسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن جو بات میں بتانا چاہتا ہوں وہ بات اب نہیں ہوتی۔

ان نئی بہاروں پر، ان نئے نظاروں پر
اک رند ہی کے ہیں رو رہے ہیں میخانے

پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں کی یاد کو سینے میں دبائے ایک مدت گزر گئی ہے۔ اب بھی جب یہ دن یاد آتے ہیں تو جذبات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ماضی کی ان یادوں میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے۔

ایسے ہی موسم میں جب شاموں کا حسن نکھر آیا تھا اور راتیں خنک ہونی شروع ہو گئی تھیں تو قادیاں میں مجلس احرار نے کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا تھا۔ صرف انعقاد کا اعلان اور وہ بھی مجلس احرار کی طرف سے ایک زبردست ہنگامے کو دعوت تھی۔ آج اتنے برس گزرنے کے بعد شاید نئی پود ان ہنگاموں کو سمجھ ہی نہ سکے اور نہ ہی کوئی مؤرخ بیان کرنے کے لئے تیار ہو۔ لیکن اس کے باوجود خطابت کی تاریخ اور شعلہ نوائیوں کی داستان میں یہ کانفرنس اپنا عنوان ڈھونڈ کر ہی رہے گی۔ ہاں تو جن دنوں اس کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا۔ اس وقت پنجاب میں مجلس احرار کا طوطی بول رہا تھا۔ اس شعلہ بیان خطیبوں کی جماعت نے غیر مسلمانان پنجاب کو بہت حد تک متاثر کر لیا تھا۔ یہ کشمیر چلو تحریک کا معرکہ سر کر چکے تھے۔ سر فضل حسین کی پوری کامیابیوں اور کامرانیوں کے باوجود مسلمانوں کے درمیانی طبقے میں مجلس احرار انکی ساکھ پر ایک گہری چوٹ لگا چکی تھی۔ غرضیکہ چاروں طرف ـــ شہر اور قریہ میں ان شعلہ نواؤں کے چرچے تھے۔ میں بھی ان چرچوں سے متاثر تھا، نویں جماعت کا طالب علم ـــ مولانا داؤد غزنوی کے خطبوں سے شدید

طور پر متاثر، احرار کے جلوس کا رسیا اب یہ موقع--- کیسے کھو سکتا تھا چنانچہ کچھ بزرگ دوستوں کے ساتھ قادیان روانہ ہو گیا۔

اب پچیس برس بعد میں یہ یادیں دھندلا گئی ہیں صرف امیر شریعت کے الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں، کہ قادیان میں ایک ہجوم تھا۔ جس کو یہ قریہ

قادیان کا وہ قریہ جس نے نبوت کو تو سنبھال لیا لیکن وہ امیر شریعتہ کے چاہنے والوں کو سمیٹنے سے قاصر تھا۔

جس نے "نبوت" کو تو سنبھال لیا لیکن وہ امیر شریعت --- کے چاہنے والوں کو سمیٹنے سے۔ قاصر تھا، کوئی گاڑی، کوئی بس، کوئی بیل گاڑی، کوئی ٹم ٹم، کوئی تانگہ، کوئی سائیکل ایسی نہ تھی۔ جو قادیان کی طرف نہ آ رہی ہو، اور رضاکار دنوں پہلے پیدل چل دیئے تھے۔ جیسے جیسے یہ مختلف دیہات میں گزرتے دیہات والے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے اور قادیان پہنچتے پہنچتے یہ خود ایک جلسہ بھی ہوتے اور ایک جلوس بھی۔ یہ پہلی تحریک تھی جس نے یہاں کے مسلمانوں کے دونوں جذبوں کو بیک وقت متاثر کیا، ان کے نعرے ان کے جذبہ عشق رسول ﷺ کو بھی متاثر کرتے تھے اور ان کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی کے جذبے کی بھی ان نعروں سے تشفی ہوتی تھی۔

اس کانفرنس کا انعقاد اکتوبر ۱۹۳۴ء کے تیسرے ہفتے میں ہوا اور اس کانفرنس کے لئے ۲۱، ۲۲،

احرار نے جھگڑنے سے گریز کیا کیونکہ اس وقت مرزائیوں کی کوشش یہی تھی کہ فساد کرادیا جائے۔

۲۳ اکتوبر کی تاریخوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے لئے ایک سکھ زمیندار کی اراضی حاصل کی گئی تھی اس زمیندار کا نام ایشر سنگھ تھا، اس اراضی پر پنڈال بھی تیار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن مرزائیوں نے اس اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اب احراریوں کے لئے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا تو وہ اس اراضی کے لئے لڑتے یا پھر شہر سے دور کانفرنس منعقد کرتے۔ احرار نے جھگڑا کرنے سے گریز کیا، کیونکہ اس وقت مرزائیوں کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ فساد کروا دیا جائے مجلس احرار مرزائیوں کے ان ارادوں کو بھانپتی تھی چنانچہ اس اشتعال کے باوجود مجلس احرار نے ایشر سنگھ کی اراضی پر کانفرنس منعقد نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے بعد قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ڈی۔اے وی سکول کے پہلو میں پنڈال تیار کیا گیا۔

کانفرنس کے دو دن پہلے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار نے قادیان سے یہ خبر بھیجی تھی کہ جس میں اس کانفرنس کے خدوخال اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"مجلس احرار اکیس، بائیس اور تئیس اکتوبر کو ایک تبلیغی کانفرنس قادیان میں منعقد کر رہی ہے۔ اس کانفرنس کے لئے بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مرزائیوں کی طرف سے مسلسل یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ اس کانفرنس سے ان کا جان ومال خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ چنانچہ مرزائیوں نے اپنی حفاظت کے لئے لاتعداد

مرہبا تیوں کو اور اپنے مریدوں کو قادیان میں جمع کرنا شروع کردیا ہے ادھر احرار کی اس کانفرنس میں بیس سے لے کر پچاس ہزار کا ہجوم پہنچا ہے۔ مزید براں کانفرنس کے منتظمین کا مطلبہ ہے کہ ان کو کانفرنس کے صدر کا جلوس نکالنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اور یہ جلوس قادیان شہر میں سے گزرے۔

اس کانفرنس کے پیش نظر آج صبح پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس خود بہ نفسِ نفیس قادیان آئے۔ ان کے ہمراہ پولیس کی بھی ایک بھاری جمعیت تھی۔ چنانچہ انسپکٹر جنرل پولیس نے کانفرنس وغیرہ کا موقعہ دیکھا اور احکام جاری کر دیئے گئے ہیں کہ اگر اس کانفرنس کے دوران میں قادیانیوں نے کوئی اجتماع منعقد کرنے کی کوشش کی تو یہ اجتماع خلاف قانون تصور ہوگا۔ انسپکٹر جنرل نے احراریوں اور ان کی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو بھی متنبہ کردیا ہے کہ وہ کانفرنس میں کسی قسم کے ہتھیار کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ لاٹھیوں کو ساتھ لانے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ مزید برآں کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والے لوگوں کےلئے ایک خاص راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ نیز اگر کسی قسم کا جلوس نکالا جائے تو اسے شہر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج شام تک قادیان میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے چار سو پولیس کے سپاہی پہنچ جائیں گے لیکن میرا اندازہ یہی ہے کہ یہ تمام پیش بندیاں بالکل غیر ضروری ہیں کیونکہ احراری ہر حالت میں کسی قسم کے جھگڑے سے اجتناب کرنا چاہتے ہیں۔ انکی کانفرنس کا پنڈال ڈی۔ اے۔ وی سکول میں بننا شروع ہو گیا ہے۔ اور ارد گرد کے تمام علاقے میں ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے مزید لاٹھیاں نہ لانے کی بھی منادی کرا دی گئی ہے۔

اس اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے پنجاب میں اس کانفرنس کے کس قدر چرچے تھے اور کتنے گوشوں سے اس کانفرنس کی کامیابی اور ناکامی کی خبروں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اس فضا میں یہ کانفرنس ہوئی اس کانفرنس کے صدر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ چنانچہ رات جب اپنا پورا سایہ ڈال چکی، لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے تو اس کانفرنس کے صدر سید عطاء اللہ شاہ بخاری تشریف لائے، ہزار ہا انسانوں کا ہجوم اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی پنڈال میں آمد اور کون سید عطاء اللہ شاہ بخاری ملتان کی سرزمین میں دفن ہونے والا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہیں، وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہیں جس کی زبان گنگ ہو گئی تھی، جس کے چہرے کا جھریوں نے احاطہ کر لیا تھا جس کے بالوں میں بڑھاپے کی سفیدی آگئی تھی، یہ وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھا جن کا شباب اور شعلہ بیانی دونوں اپنے عروج پر تھے، جو لاوڈ سپیکر کے بغیر لاکھوں کے ہجوم کو مسخر کر سکتا

> **یہ وہ عطاء اللہ شاہ بخاری تھے جن کا شباب اور شعلہ بیانی دونوں اپنے عروج پر تھے**

تھا، جس کا حسن اور بیان دونوں الگ الگ جادو جگاتے تھے۔ پچاس ہزار کا مجمع، رات کی خاموشی، قمقموں کی روشنی اور اتنے میں حسن و نور کے پیکر، شعلہ بیان خطیب اور شریعت کے امیر کی آمد

تم آگئے تو از سر نو زندگی ہوئی

بس پھر کیا تھا مجمع میں کہاں ایک خاموشی اور ہو کا عالم تھا کہ اب وارفتگی اور دیدار یار کی بے تابی نے سب کو آن گھیرا ہے اور اس بے تابی اور وارفتگی کا اظہار نعروں کی

ہونا ہی ہوتا ہے، شاہ صاحب ہیں کہ مسکراتے ہوئے مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اسٹیج پر پہنچے چاروں طرف نگاہ مست انداز میں دیکھا بس پھر کیا تھا نعروں کا ایک اور سیل ٹوٹ پڑا۔ اور امیر شریعت فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے ہیں۔ مجمع خاموش ہوا۔ تلاوت ہوئی نظم ہوئی۔ اب سے پچیس برس پہلے کی تفصیلوں کو دہرایئے اور انہی تفصیلوں کو جن پر شاہ صاحب کی تاریخی تقریر کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہوں، شاہ صاحب نے یہی کوئی نو ساڑھے نو بجے تقریر شروع کی ہو گی اور رات تھی کہ وہ بھی دم بخود گزرے جا رہی تھی لیکن شاہ صاحب کی شعلہ بیانی بڑھتی جا رہی تھی، اس شعلہ بیانی اور آتش نوائی کو قدم قدم پر نعروں، قہقہوں اور آنسوؤں کے ذریعے خراج عقیدت پیش ہو رہا تھا۔ یہی وہ تقریر تھی جس میں شاہ صاحب نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔

"تم اپنے بابا کی "نبوت" لے کر آؤ اور میں اپنے نانا کی نبوت لے کر آتا ہوں تم حریر۔

دیبا زیب تن کر کے آؤ اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق کھدر پہن کر آؤں، تم یاقوتی اور پلومر کی شراب کے خم لنڈھا کر آؤ اور میں روکھی سوکھی روٹی کھا کر آؤں اور پھر زمانہ فیصلہ کرے کہ کون سچے نبی کی اولاد ہے۔"

یہ تقریر جو رات کی خاموشی میں شروع ہوئی تھی، جو عشاء کی نماز کے بعد ابھی رات کا آغاز تھا لوگوں نے سننی شروع کی تھی یہ تقریر پوری رات ہوتی رہی اور مجمع بیٹھا رہا۔ ایک بھی ذی نفس ایسا نہیں تھا جس نے تھکن کا اظہار کیا ہو، جس کے چہرے سے اکتاہٹ کی غمازی ہوئی ہو۔ اتنے میں صبح کا نور پھیلنا شروع ہو گیا۔ اور مؤذن نے اذان دے دی تقریر تھی کہ اس وقت بھی اپنے عروج پر تھی لیکن مؤذن نے اس سیل رواں کو روک دیا اور خطابت کے دریاؤں کو بند مار دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں بہت کم خطیب اور مقرر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے رات رات بھر تقریر کی ہو جنہوں نے لوگوں کو اس قدر مسحور کیا ہو جیسا کہ امیر شریعت نے کیا ہے۔

کوئی آیا، نہ آئے گا، لیکن
کیا کریں گر نہ انتظار کریں

اور غالباً اسی موضوع کو حسرت موہانی نے کہا تھا۔

ہلاکشان غم انتظار ہم بھی ہیں
خراب گردش لیل و نہار ہم بھی ہیں۔

آج ربع صدی گزرنے کے بعد جب ہم اس عظیم ہستی کی یادیں سمیٹ رہے ہیں تو کچھ حلقوں میں یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے۔ کہ آخر یہ ہستی اتنی اہم کہاں تھی کہ اسکی یاد میں آنسو بہائے جائیں، صفحات سیاہ کئے جائیں اخبارات اور رسالوں کے نمبر نکالے جائیں۔ آخر احرار یا بخاری نے کون سے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ کہ انکے کارناموں کی فہرست افتراق وانتشار انگیز تحریکوں سے بھری پڑی ہے اس لئے انکو دوبارہ ہوا دینا کہاں کی خدمت اور کہاں کی نیکی ہے۔

یہ سب سوالات آج کل بہت سے حلقوں میں اٹھائے جا رہے ہیں آج ضروری ہے کہ ان سوالات کے جواب دیئے جائیں تاکہ تاریخ کی گرہیں کھل سکیں۔ اور جن تحریکوں کو افتراق و انتشار کا مظہر بتایا جاتا رہا ہے یا آج بتایا جا رہا ہے اس کے متعلق مورخ کو مواد مل سکے۔

مجھے اس صحبت میں صرف ایک مختصر سے سوال کا جواب دینا ہے۔ یہ سوال پچھلے چالیس پچاس برس سے اٹھایا جا رہا ہے کہ قادیانیوں یا احمدیوں کے خلاف تحریک مسلمانوں میں افتراق پھیلانے کے مترادف نہیں ہے۔ ایک اور طبقے کی طرف سے بھی یہ سوال اٹھایا جاتا تھا۔ کہ مسلمانوں کی سیاست کو مذہب کا تابع بنایا جا رہا ہے۔ اور اس طرح غلط اقدار اور رجعت پسند نظریات کو شہ دی جا رہی ہے؟ ان سوالوں کا جواب تفصیل چاہتا ہے اور ان

کا جواب پچھلے پچاس برس کی تحریکوں میں پھیلا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود ایک بات واضح ہے کہ قادیانیوں کے خلاف تحریک مسلمانوں کی ایک بہت اور بالخصوص پنجاب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سامراج دشمن تحریک تھی اور پنجاب میں سامراج اور اس کے مسلمان حلیفوں کو شکست دینی۔ اس وقت تک ممکن نہیں تھی۔ جب تک قادیانیوں کا طلسم نہ توڑا جاتا اور عوام کو انکی اصل حقیقت سے آگاہ نہ کیا جاتا۔ باقی دوسرے سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ سامراج اور رجعت پسند طاقتیں اکثر و بیشتر غلط مذہب اور لوگوں کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے اثر کو عوام میں پھیلاتے ہیں اس لئے سامراج دشمن تحریکوں اور جماعتوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سامراج کی ان سازشوں کو بھی بے نقاب کریں۔ اور آج یہ حقیقت ہے کہ پنجاب میں اس وقت میں مجلس احرار نے سامراج کی اس سازش کو بے نقاب کیا تھا۔ اس سلسلے میں تاریخ لکھنے والوں کو بہر حال توجہ کرنی چاہیے۔

امیر شریعت کی اس تقریر کی بنا پر ۱۵۳ الف کے تحت ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور ان پر مقدمہ چلا اور ان کو ماتحت عدالت نے سزا سنا دی لیکن جی۔ ڈی کھوسلہ جو ان دنوں گورداس پور میں سیشن جج تھے نے امیر شریعت کی سزا کو گھٹا کر تا برخاست عدالت تک رہنے دیا اور اپنے فیصلے میں احمدیت کے متعلق بہت ہی سخت تجزیہ کیا۔ اور احمدیوں نے قادیان میں اپنے مخالفین پر مظالم کو تسلیم کیا۔ اس فیصلے پر زبردست لے دی ہوئی اور احمدیوں نے بالاخر ان ریمارکس کو حذف کروانے کے لئے ہائیکورٹ کی طرف رجوع کیا۔ یہ مقدمہ بذات خود ایک داستان ہے۔ اسے کسی اور وقت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

ایک خط ایک نصیحت

عزیزم عبداللہ ملک سلمہ۔

خوش رہو جیتے ہو، آباد رہو اور شاد رہو۔ زندگی کی شب و روز اسی طرح بسر ہوتے ہیں اب باقی کیا رہ گیا ہے کہ اس کے لئے اضطراب ہو۔ نہ بیتے ہوئے دنوں کا افسوس ہے اور حال سے کوئی شکوہ، مستقبل کی فکر ہی کیا۔ جو لوگ مستقبل کیلئے جی رہے ہیں ان سے پوچھئیے؟ اپنا تو بس اب چل چلاؤ ہے گور کنارے بیٹھا ہوں۔ دیکھئے کب بلاوا آ جائے۔ اب اسکے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہا۔ کہ اپنے اللہ سے صبح و شام بھیک مانگتا ہوں۔ وہی پالنہار ہے وہی آخری سہارا ہے۔ اس کے ہاں عفو و درگزر کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارا خدا ہمارا خدا ہے۔

سزا گناہوں کی دے چکا ہے۔ جزا پشیمانی کی دے گا تمہارے لئے دن رات دعاء کرتا ہوں۔ اب چمن اور اس کی شاخیں تم نوجوانوں کی باغبانی کے سپرد جب تک جیو وضع داری سے جیو کہ یہی ایمان کی نشانی اور حاصل زندگانی ہے۔ والسلام و دعا عطاء اللہ شاہ بخاری

دیار دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

جناب مظفر مہدی ہاشمی (مظفر گڑھ) ۱

میں پانچ چھ برس کا بچہ تھا جبکہ ان کی بھر پور جوانی تھی۔ پورا فرنگی انڈیا ان سے مسحور تھا۔ ہمارے ہاں ان کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ ضلع مظفر گڑھ میں ان کے مرید لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ میری پھوپھی نے بہت بعد میں مجھے بتلایا کہ ایک دن مشہور ہو گیا کہ امیر شریعت کو فرنگیوں کے کسی کارندے نے شہید کر دیا ہے۔ اس دن میرے والد صاحب، میاں خدا بخش ہاشمی شکار پر گئے ہوئے تھے۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھی میں نے اپنے والد صاحب کی تلوار اپنے کندھے پر رکھی جو میرے قد سے بھی بڑی تھی اور گھر سے باہر نکل پڑا اور زبان سے اعلان کیا کہ جس کسی نے بھی میرے چچا کو شہید کیا ہے آج میں اسے قتل کر دوں گا میری پھوپھی نے ملازمین کو کہا کہ فوراً جاؤ اور اس سے تلوار چھین کر اور پکڑ کر گھر واپس لاؤ۔ میں ابھی گھر سے کچھ فاصلے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ وہ لوگ پہنچ گئے اور مجھے زبردستی گھر لے آئے میں سارا دن روتا رہا شام کو میرے والد صاحب گھر آئے انہیں جب حقیقت حال بیان کی گئی تو انہوں نے مجھے پیار کیا اور میری پھوپھی سے بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ اگر یہ کسی بڑے یا بچے کو مار بھی دیتا تو میں ذمہ دار تھا تم نے اس کے جذبے کو ابھرنے سے کیوں روکا؟

پھر ایک روز مجھے بتایا گیا کہ میں نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے تقریباً پانچ چھ سو میل دور، جامعہ ملیہ اسلامی دہلی جانا ہے ان دنوں یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ بڑے بڑے زمیندار اور پیسے والے لوگ بھی اپنے

شاہ جی نے کبھی بھی جامعہ ملیہ میں جا کر وہاں کی انتظامیہ پر کوئی احسان نہ جتلایا کہ وہ ان کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں

بچوں کو، صرف تعلیم کے لئے اتنی دور نہیں بھیجتے تھے۔ اور اگر بھیجتے بھی تھے تو میٹرک کے بعد۔ اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ تو فرنگی حکومت کے خلاف ایک ادارہ تھا۔ جہاں پنجاب کے بہت کم مسلمان زمیندار اپنے بچوں کو داخل کرانے کی جرات کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ دور نزدیک کے لوگ آ کر میرے والد صاحب کو اس کام سے

منع کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر انہیں تو "شاہ جی" کے حکم کی پاسداری تھی۔ جنہوں نے فرمایا تھا کہ بچوں کو انگریزی حکومت کے کسی بھی ادارے میں داخل کرانے کا نتیجہ انہیں غلامی میں پختہ کرنا تھا۔ اسی بنا پر تیسری جماعت تک کی کتابیں میں نے ایک پرائیوٹ استاد سے پڑھیں، اور پھر چوتھی جماعت میں دہلی جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں ابتدائی مدرسے کے استاد بھی ہائیڈ برگ، آکسفورڈ اور کولمبیا یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے اور جامعہ میں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خان جو ان دنوں شیخ الجامعہ تھے اور آزادی کے بعد بھارت کے صدر منتخب ہوئے، ابتدائی مدرسے میں چھٹی جماعت کے بچوں کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔

میرے جیسے اور بھی سینکڑوں ہزاروں بچوں اور ان کے والدین کو جامعہ ملیہ میں داخلے کی ترغیب دیتے۔ بعض لوگ بات مان لیتے اور بعض نہیں مانتے لیکن شاہ جی نے کبھی بھی جامعہ ملیہ میں جا کر وہاں کی انتظامیہ پر کوئی احسان نہ جتلایا کہ وہ ان کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مخیر حضرات کو اس ادرے کے لئے چندہ بھیجنے کو بھی کہتے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جامعہ والوں کو بھی یہ پتہ چلتا کہ وہ رقم کس کی معرفت وہاں پہنچی تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری، تمام جنوبی ایشیا واحد عالم دین تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ نہ کبھی مولانا کا لقب پسند کیا اور نہ ہی علامہ کا، لوگوں نے انہیں از خود امیر شریعت کا لقب دیا جبکہ انہوں نے اس لقب کو بھی اپنے نام و نمود کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ تقریر ہو یا کسی محفل میں گفتگو وہ ہر مقام پر اپنے آپ کو یا تو صرف بخاری کہتے تھے۔ اور یا پھر عطاء اللہ شاہ۔ فرنگی حکومت ہو یا ہندو کانگریس، انہوں نے کبھی بھی ان کے کسی التفات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، یہاں تک کہ انہوں نے عوام سے بھی اپنے لئے نہ کبھی چندہ مانگا اور نہ ہی کسی وظیفے کے خواستگار ہوئے ان کی شیر جیسی سرخ آنکھیں اس دنیا میں کسی کی بھی ممنون نہیں ہوئیں۔ اور نہ ہی جھکیں، دین ہو یا دنیا، انہوں نے اپنی ہر بات اپنے پروردگار پر چھوڑ رکھی تھی اور یہ میرا ذاتی خیال ہے اور تجربہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب سے بھی کچھ مانگا تو اس کی رضا مانگی، تسلیم مانگی، اور قناعت مانگی، وگرنہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن ہمارے ہاں "قریشی مظفر گڑھ" میں تشریف فرما تھے، ان

ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں خوش ہوں میری خوشی بے کراں ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصہ میں بھی سامراج کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔"

"تم میری رائے کو خود فروشی کا نام دو میری رائے ہار گئی۔

تقسیم ملک کے بعد شاہ جی نے اپنی بیشتر تقریروں میں کہا کہ ایک شخص ایک خاندان میں شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کا باپ اور بھائی اور دوسرے رشتہ دار اس رشتہ پر راضی نہیں۔ باوجود اسکے وہ شادی کر ہی لیتا ہے ماں باپ، اپنے پرائے اگرچہ اس رشتہ پر راضی نہ تھے۔ لیکن شادی ہونے کے بعد مبارک بادیں دیتے اور دعوتیں کرتے ہیں۔ وہ کون سا دیوث باپ ہوگا۔ جو اپنی اس بہو کی عصمت پر حملہ کرنے یا اس کو نقصان پہنچانے کی اجازت دے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ اب اس کی حفاظت ہمارا جزو ایمان ہے۔"

کے چند مرید بھی بیٹھے تھے کہ باتوں میں سے بات نکلی اور کہنے لگے کہ بعض اوقات میرے اوپر ایسی واردات بھی آتی ہیں کہ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اگر میں کسی دیوار کو بھی کہوں تو وہ آگے کی طرف چلنے لگے۔

ان کی بے مثل خوداری نے انہیں قناعت عطاء کی اور اسی قناعت کی بنا پر نہ وہ کسی کے احسان مند ہوئے اور نہ ہی ممنون یہاں تک کہ جب ان کی وفات کے بعد ان کا جنازہ پڑھا جا چکا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہزاروں

میں نے از خود مہاتما لکھ دیا تھا، فرمانے لگے اسے کاٹ دو صرف گاندھی لکھو

لوگوں نے شور مچا دیا کہ انہیں ملتان کے قلعہ کہنہ پر دفن کر کے ان کا اونچا مزار تعمیر کیا جائے۔ اس بات کے لئے بہت سے با اثر افراد جو وہاں پر موجود تھے کہنے لگے کہ وہ ابھی جا کر کمشنر ملتان سے سرکاری طور پر اجازت لے آتے ہیں لیکن ان کے صاحبزادے سید عطاء المنعم ابومعاویہ مدظلہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ان کے اباجی نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کوئی چیز حکومت سے نہیں مانگی اور اب ان کی رحلت کے بعد ہم انہیں سرکاری اراضی کا مرہون منت نہیں ہونے دینگے۔

سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمتہ اللہ علیہ تقریر کے بادشاہ تھے، اردو، پنجابی، فارسی، یہاں تک کہ عربی چاروں زبانوں کے الفاظ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے تھے اور وہ انہیں جس طرح چاہتے استعمال میں لاتے۔ عشا کی نماز کے بعد جب ان کی تقریر شروع ہوتی تو صبح کی اذان ہو جاتی مگر نہ الفاظ ختم ہوتے اور نہ ہی سامعین لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے اور مسحور ہو کر بیٹھے رہتے۔ شاہ جی جب چاہتے تمام اجتماع کو ہنسا دیتے اور جب چاہتے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو کی جھڑیاں لگا دیتے۔ ان کی زبان ایک ایسی دو دھاری ذوالفقار تھی کہ کاٹ کرتی تو انگریز اور ہندو، دونوں کی گردنیں اڑا دیتی اور طنز کرتی تو اپنوں کے سینوں میں اتر جاتی لطیفے بیان کرنے پر آتے تو سننے والے پہلے ہنس پڑتے اور پھر جب انہیں ان لطیفوں کی حقیقت **کا علم** ہوتا تو رو پڑتے اور جب کسی المیے کی داستان چھیڑتے تو اس کے آخر میں کوئی ایک ایسا فقرہ چسپاں کر دیتے کہ لوگوں کو امید کی کرنیں دکھائی دینے لگتیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے اور نہ ہی اپنی قوم کو کبھی مایوسی کی طرف دھکیلنے کی کوئی کوشش کی انہیں اپنے خدا پر مکمل بھروسہ تھا۔ انہیں اپنے ہادی صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ایمان تھا۔ اصحاب کبار کے پیروکار تھے اہل بیت کی تشبیہ کا انہیں پاس تھا اور اولیاء کرام کی خدمات کے پوری طرح قائل تھے وہ بدعت کو بدعت کی حد تک رکھتے اور جیسا کہ قیام پاکستان کے بعد کے علماء غلو پر اتر آئے جن میں سے بعض، بدعت کی مذمت میں حد سے بڑھ گئے اور بعض دوسرے بدعت کو بدعت کہنے سے ہی انکاری ہو گئے۔ شاہ جی نے ان دونوں کو ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کی شاہ جی فرماتے تھے کہ سب کو مل کر مرزائیت کے کفر کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان کے دور میں تمام مکاتب فکر کے لوگ ان کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرتے۔ دیو بندی اور بریلوی جھگڑے کی جو شکل قیام پاکستان کے بعد نظر آنے لگی ہے وہ ان کے دور میں کہیں نہیں تھی۔ بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے بہت سارے شیعہ مسلک کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ان کی تقریریں سنتے اور ان کی محفلوں میں آ کر بیٹھتے۔

دہلی ہی کی بات ہے کہ ایک دفعہ مجھے پتہ چلا کہ شاہ جی وہاں آئے ہوئے ہیں چنانچہ میں جمعہ کی چھٹی والے دن ان کے پاس پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں مجھے حکم فرمایا کہ کاغذ قلم سنبھالو اور جو کچھ میں کہوں لکھ کر اخبارات میں میری طرف سے بیان بھجوا دو۔ جب لکھوا چکے تو فرمایا کہ اب مجھے پڑھ کر سناؤ۔ وہاں ایک جگہ گاندھی کا لفظ تھا جس کے آگے میں نے ازخود مہاتما لکھ دیا تھا۔ فرمانے لگے اسے کاٹ دو اور صرف گاندھی جی لکھو۔ یہ واقعہ اس لئے

مجھے ایسا لگا کہ جیسے آج شاہ [illegible]

بھی اہم ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انکا کانگریس کی طرف جھکاؤ ضرور تھا لیکن اتنا نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے فارمولے سے اختلاف انکا اپنا تھا نہ کہ کانگریس کی پیروی میں تھا۔

ویسے تو تمام جنوبی ایشیا کے برصغیر میں، وادیٔ کشمیر سے لیکر راس کماری تک اور خلیج بنگال سے لیکر درہ خیبر تک ان کے مرید اور معتقد لاکھوں کی تعداد میں تھے لیکن ان کے پیروکار جتنے جنوبی پنجاب میں تھے اتنے کہیں اور نہ تھے میں بچہ تھا اور میرے والد صاحب مجھے ان جلسوں میں اکثر ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انکی تقریر ختم ہوتی تو لوگوں کا ہجوم ان کی بیعت کے لئے تیار ہو جاتا تو ان کے حکم پر لوگ اپنی پگڑیاں اتار کر ایک دوسری سے گانٹھ لیتے اور اس طرح ایک طویل قطار بن جاتی شاہ جی کلمہ پڑھاتے اور لوگ ان پگڑیوں کو ہاتھ لگا کر کلمے کو دہراتے اور اس طرح خوش ہو کر مرید بن جاتے۔ دور دراز کے دیہاتوں میں حضرت شاہ جی قبلہ، جتنا

سرکنڈے کے جھونپڑوں میں رہ کر خوش ہوتے اتنا پکے مکانوں میں نہ ہوتے بلکہ ہمارے ہاں جب آتے تو بھی سرکنڈے کے ایک چھپر میں ریت بچھادی جاتی، پھر اس پر پانی کا چھڑکاؤ کر دیا جاتا جس سے ہاڑ کی لُو بھی ٹھنڈی ہو جاتی جہاں آپ قیام فرماتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔

اب ایک آخری بات۔ گرمیوں کے دن تھے اگست کا مہینہ تھا اور سال ۱۹۶۱ء تھا کہ میں جب صبح کو جاگا تو مجھ قبلہ شاہ جی کی یاد بہت زیادہ آنے لگی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آج ملتان جا کر ان سے ضرور ملاقات کرونگا۔ تیار ہونے میں ذرا دیر ہو گئی۔ ان دنوں میرے پاس ایک موٹر سائیکل تھی۔ دن کے تقریباً ۱۱ بجے میں ملتان پہنچ گیا۔ کوٹ تغلق شاہ کے پاس جب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ مجھے ایسے لگا کہ کوئی بڑا حادثہ ہو چکا ہے۔ میں نے جب ایک راہگیر سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھا اور بتلایا کہ آج صبح قبلہ شاہ جی انتقال فرما گئے ہیں۔ اور آج بعد نماز ظہر ان کا جنازہ ہو گا۔ میں خوف زدہ ہو کر رہ گیا دکھ ضرور ہوا اور بہت زیادہ ہوا لیکن اطمینان اس سبب ہوا کہ آج شاہ جی نے مجھے اپنے جنازے میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر بلایا ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے سید عطاء المنعم ابومعاویہ ابو ذر حسنی بخاری نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں مجھے بھی شرکت کا اعزاز نصیب ہوا یہ واقعہ میری زندگی کا ایک بیش قیمت اثاثہ ہے کیا یہ ایک ولی اللہ کی کرامت تھی؟ ☆☆☆

ڈسٹرکٹ جیل میانوالی کا ایک گمشدہ صفحہ

اسرار بصری مرحوم

میں دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن۔
مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز!

میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدّت اور حرارت پیدا کردی ہے۔ محبت اور نفرت کے یہ دو زاویے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں ان کا سودا ہو ان کے لئے پابہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے، کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے، کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانے کی "آبرو" پر بوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں!

لیکن ۱۹۲۲ء کی تحریک خلافت کے زمانۂ قید طلب پر غور کرتا ہوں تو نگاہوں میں ایک تصویر سے کھنچ جاتی ہے۔ میانوالی کی ڈسٹرکٹ جیل احباب کی ایک یادگار بزم سب اہلِ ذوق، اہلِ نظر، اہل دل اور اہل علم جمع تھے، مولانا احمد سعید دہلوی حدیث پڑھایا کرتے۔

عبدالمجید سالک دربار اکبری کا سبق دیتے، مولوی لقاء اللہ کی نپی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتیں۔ صوفی اقبال پانی پتی کے "اشغلے" خدا کی پناہ! عبداللہ چوڑی والے کی ٹکسالی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوئیں اور آصف علی کھلتے تو پھولوں کے تختے بچھ جاتے۔ جی خوش کرنے کے لئے مشاعرں کا اہتمام ہوتا۔ شاعر طرحی اور غیر طرحی کلام سناتے۔ کبھی سالک صدر ہوتا، کبھی آصف اور کبھی:

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند!

اختر علی خاں نے ایک دفعہ معرکے کی غزل سنائی، سب لوٹ پوٹ ہوگئے۔ میرا ماتھا ٹھنکا، کچھ یاد سا آگیا۔ میں نے اختر سے کہا۔ میاں مقطع کہو۔ وہ کسی قدر جھینپا۔ میں نے کہا تو لو، پھر مجھ سے سنو، مقطع تھا:

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو
امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں!

سب ششدر رہ گئے۔ ارے امیر مینائی کی غزل اڑالی، سوالات کی ایک بوچھاڑ ہونے لگی۔ اختر علی خاں مقطع کے ساتھ ہی بزم سے غائب ہوگئے۔ دو دن روٹھے رہے۔ تیسرے دن بہ مشکل راضی کیا گیا۔ امیر مینائی کا دیوان ان کے تکیے تلے رکھا تھا۔ میں نے اٹھایا تو غزل کا صفحہ ہی پھٹا ہوا تھا۔

جب طبیعت ذرا اور شگفتہ ہوتی تو مولانا ڈھونک بجاتے صوفی مرحوم تالی پیٹتا، داؤد غزنوی "حال کھیلتے" کبھی اختر گاتا، کبھی سالک، کبھی عاجز اور تینوں، وہ رنگ بندھتا کہ درودیوار جھومتے اور کائنات بھی جھک کر گوش بر آواز ہوجاتی۔

اب کہاں لیکن وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں
یعنی سب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ

چند لمحے

آزاد شیرازی

پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ جب میں مرحوم خاکسار تحریک کا ایک سرگرم سپاہی تھا۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی کی کتاب "قول فیصل" میں نام لیے بغیر احراری رہنماؤں کا تذکرہ کچھ نامناسب الفاظ میں کیا گیا تھا۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ یہ اشارہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرف ہے۔ اس طرح امیر شریعت سے میرا غائبانہ تعارف، قول فیصل، کے اسی پیراگراف کے ذریعے ہوا۔

تقسیم ملک سے پیشتر احرار رہنماؤں، مولانا داؤد غزنوی، آغا شورش کاشمیری، خواجہ عبدالرحیم عاجز مرحوم، مرزا جانباز سے نیاز مندانہ اور دوستانہ مراسم ضرور قائم ہوگئے تھے لیکن ان حضرات سے ذہنی اتحاد نہ ہوسکا۔ اور احرار کے بارے میں حسنِ ظن نے میرے ذہن میں کبھی جگہ حاصل نہ کی۔

قیام پاکستان کے بعد میرا حلقہ احباب لائلپور میں زیادہ تر احراری دوستوں کا بنا۔۔۔ جن میں خواجہ جمال دین بٹ۔ مرحوم مولانا عبدالغفار غزنوی، مولانا عبیداللہ احرار اور مولانا تاج محمود شامل تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں ان دوستوں نے ترجمانِ احرار روزنامہ آزاد لاہور کے لیے مجھے اغوا کر لیا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے دفتر احرار کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ جہاں احرار کے خوبصورت مولوی حضرت مجاہد الحسینی سے میرا سامنا ہوا۔ اور اس کے بعد دوسرے احرار رہنماؤں سے شرفِ نیاز حاصل ہوتا رہا۔

روزنامہ آزاد کی ادارت سنبھالے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔۔۔ ایک دوپہر میں اپنے کمرے میں بیٹھا مصروف کار تھا کہ مجاہد الحسینی صاحب زبردستی مجھے کھینچ کر دفتر سے نیچے لے گئے جہاں ایک کار کھڑی تھی۔ اس کار میں امیر شریعت تشریف فرما تھے۔ میں سلام عرض کر کے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ شاہ جی کار سے باہر نکلے مجاہد صاحب نے موزوں الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ شاہ جی نے مصافحہ کے ساتھ معانقہ بھی فرمایا۔ بڑے پیار سے مجھے تھپکی دی اور فی البدیہہ فرمایا۔ اچھا تو آپ ہیں ہمارے نئے ایڈیٹر آزاد شیرازی۔

اگر آزاد شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارارا

شاہ جی تشریف لے گئے لیکن میں اس ملاقات کا مزا کئی دن تک لوٹتا رہا۔ اور آج بھی جب کبھی شاہ جی کا تذکرہ ہوتا ہے میرے سامنے اس پہلی ملاقات کا منظر کھنچ جاتا ہے۔

روزنامہ آزاد لاہور کی ادارت کا زمانہ میری صحافتی زندگی کا بلاشبہ سنہری دور تھا۔ مجاہد صاحب کی دوستی اور دوسرے احرار رہنماؤں کی شفقت اور محبت نے میرے نظریات میں اہم انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن

زندگی پیار کی دو چار گھڑی ہوتی ہے
چاہے تھوڑی سی ہو یہ عمر بڑی ہوتی ہے

یہ دور نہایت مختصر ثابت ہوا۔ اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں آزاد پابند ہو گیا۔ شاہ جی اور دوسرے احرار رہنما اسیر ہوئے۔ اور میں نومبر ۱۹۵۳ء میں دوبارہ سعادت، کی ادارت کرنے لائلپور پہنچ گیا۔

تحریک چلی، ختم ہوئی۔ مقدمات چلے اور بالآخر شاہ جی اور دوسرے رہنما رہا ہوئے جس کے فوراً بعد پیپلز کالونی کے وسیع میدان میں شاہ جی نے ایک عظیم اجتماع سے وہ تاریخی خطاب کیا جسے حرف بحرف قلم بند کرنے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل ہوئی۔ یہ خطاب شاہ جی کے علم واجتہاد ہی نہیں ان کے خلوص، نیک نیتی، جرأت اور شجاعت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اور اسے سننے کے بعد شاہ جی کی ذات سے جو والہانہ عقیدت اور مجذوبانہ محبت مجھے ہوئی. ہے وہ ناقابل بیان ہے۔

یہی عقیدت اور محبت تین سال بعد مجھے ترجمان مجلس تحفظ ختم نبوت روزنامہ نوائے پاکستان کی ادارت کے لیے پھر لاہور کھینچ لائی۔ اور اس زمانے میں میری خوش قسمتی سے شاہ جی بیمار ہو کر لاہور میں حکیم نبی جمال سویدا صاحب کے زیر علاج حاجی دین محمد صاحب کے یہاں حبیب گنج بادامی باغ میں مقیم ہوئے

میں روزانہ یا ہر دوسرے روز وقت نکال کر شاہ جی کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ یہاں جلوت و خلوت میں ان کے ارشادات سے مستفیض ہوتا رہا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شاہ جی تہبند باندھے ڈیوڑھی ہی میں کرسی پر تشریف فرما ہوتے درویشی و سلطانی کو شاہ جی کی ذات میں جمع ہوتے میں نے دیکھا ہے۔ شاہ جی کو میں نے انکی جوانی میں نہیں بڑھاپے ہی میں دیکھا ہے۔ لیکن ان کے چہرے کے نقوش پیشانی کے نور کو دیکھتے رہنے کی خواہش ہمیشہ بیدار رہی۔ شاہ جی خاموش رہتے تو کسی قدیم یونانی فیلسوف کا مجسمہ دکھائی دیتے، بولتے تو زبان سے پھول برساتے، روتے تو آنکھوں سے خون دل بہاتے اور مسکراتے تو بجلیاں گراتے تھے۔

شاہ جی برطانیہ میں پیدا ہوتے تو لوگ شکسپیئر کو بھول جاتے ایران میں پیدا ہوتے تو بزرجمہر ہوتے، یونان میں پیدا ہوتے تو سقراط ہوتے۔ لیکن وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے جہاں ایسے پیمبر پیدا ہوئے کہ لوگ انکا نام تک نہیں جانتے۔ شاہ جی پیغمبر تو بہر صورت نہ تھے۔۔۔ لوگ انہیں کیسے پہچانتے۔ انہیں کیوں یاد کریں، انکا ذکر کیوں کریں۔

شاہ جی عمر بھر مُردوں کو قرآن سناتے رہے۔ قبرستانوں میں اذانیں دیتے رہے۔۔ لیکن اُن مُردوں کو نہ

شیطان نے کتنی جرأت کا ثبوت دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو نہیں مانا۔ اور آخر تک نہیں مانا۔ ابدی لعنت کو قبول کر لیا۔ مگر منافقت نہ کی۔۔۔ اگر ہم اس کو مشورہ دیتے کہ کم بخت نہیں مانتا آدم کو دل سے نہ سہی ظاہراً تو سجدہ کر دے مقابلہ کر کے کیوں جہنمی بنتا ہے۔

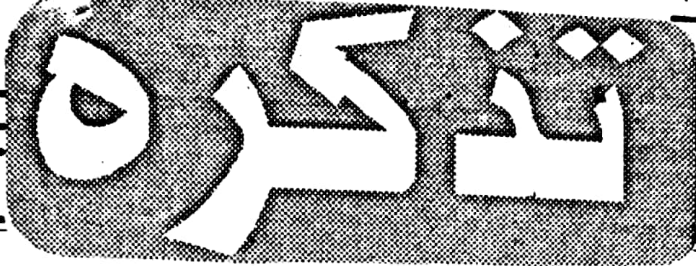
وہ کیا کہتا یہی تو جواب دیتا کہ جہنم منظور ہے مگر منافقت نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ باطل کے لئے اتنی صلابت اور استقامت کا ثبوت دے تو ہم حق کے لئے کیوں نہ دیں۔"

ایک دفعہ شاہ جی بالا کوٹ شاہ اسماعیل شہید کے مزار پر حاضر ہوئے تو غمگین ہو کر حسرت آمیز لہجہ میں فرمایا۔ "کہ محدث پیدا ہوئے عالم پیدا ہوئے اولیاء آئے مگر اسماعیل شہید نہ پیدا ہوا اور نہ ہو گا۔

جگا سکے۔۔ ان قبرستانوں کو زندہ نہ کر سکے۔۔۔ اور بالاخر خود ان قبرستانوں میں جا بسے۔ لیکن آج بھی ان قبرستانوں میں سننے والے کان شاہ جی کی اذان سن رہے ہیں۔

شاہ جی کی تربت کا ہر ذرہ آج بھی تحفظ ختم نبوت کے لیے بے قرار ہے۔ ان کی آنکھیں آج بھی تربت سے باہر کا منظر دیکھ کر رو رہی ہیں۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما



عمر اور علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

ایک بار حضرت شاہ صاحب سے پوچھا گیا کہ علی اور عمر میں کیا فرق ہے۔ آپ نے فوراً ارشاد فرمایا بڑا فرق ہے۔ علی مرید ہیں اور عمر مرید نہیں علی کیا، صدیق کیا، تمام صحابۂ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) مرید تھے۔ مگر عمر مرید نہ تھے، ایک شخص نے بھرے مجمع میں دریافت کیا تو پھر کیا تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے فوراً جواب دیا سارے مرید تھے مگر عمر مراد تھے۔ باقی خود حلقۂ بگوش اسلام ہوئے اور عمر کو اللہ تعالیٰ سے مانگا گیا اور خود چل کر آئے اور عمر کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء کی گئی یہ مرید نہیں مراد ہیں۔ پھر فرمایا۔ میں بیٹا علی کا ہوں۔ نفس میرا بھی چاہتا ہے کہ انہی کو سب کچھ کہوں لیکن عمر چھوڑتے نہیں وہ خود منواتے ہیں عمر کو نکال دیجئے پھر اسلام کی تاریخ میں کیا رہ جاتا ہے۔

سیدنا فاروق اعظم نے کیا کام کیا

ایک دفعہ اثناء تقریر میں کسی نے پوچھا کہ شاہ صاحب! عمر نے کیا کام کیا جو آپ بار بار انکا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ عمر سے اللہ تعالیٰ نے وہ کام لیا۔ جو نوح علیہ السلام سے ساڑھے نو سو سال تک نہیں لیا۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نہیں لیا۔ بھائی عمر عمر ہے، جی میرا بھی چاہتا ہے کہ باپ ہی کی تعریف کروں۔ مگر عمر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا صحابہ اور بھی تھے مگر آگے ہو کر عمر نے ہی حق کو بلند کیا۔

محترم مظفر علی صاحب شمسی نے دریافت کیا کہ حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ میں کیا فرق ہے۔ فرمایا خدیجہ کا نکاح محمد بن عبداللہ سے ہوا اور عائشہ کی شادی محمد رسول اللہ سے ہوئی۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ بنیں یہ نبوت کی زوجہ بنیں۔"

اک مردِ باکمال وہ بھی تھا

پروفیسر خالد بزمی ایم اے (عربی) ایم اے (اسلامیات)

ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک

"برادران اسلام! آج رات کو۔۔۔ بعد نماز عشاء مسجد خیر الدین مرحوم میں۔۔۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔۔ تقریر فرمائیں گے۔ آپ حضرات کو چاہیے کہ جوق در جوق تشریف لا کر جلسے کی رونق کو۔۔۔ دوبالا فرمائیں۔"

ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔

یہ ڈھنڈورے کے وہ الفاظ ہیں جو اکثر امرتسر کے بازاروں اور سڑکوں پر گونجا کرتے تھے۔ اور جب لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر ہے تو یہ الفاظ ڈھنڈورے سے زیادہ لوگوں کی زبانوں کے ذریعے سارے شہر میں پھیل جایا کرتے تھے مجھے یاد ہے کہ امرتسر میں جب بھی شاہ جی کی تقریر ہوتی تو مسجدوں میں خاص طور پر یہ خبر کسی اہتمام یا انتظام کے بغیر ہی از خود ہر نمازی تک پہنچ جاتی تھی۔ اور اگر تقریر مسجد خیر الدین میں ہوتی تو لوگ اکثر عموماً عشاء کی نماز وہیں ادا کرتے تھے تاکہ اسٹیج کے قریب ہی جگہ حاصل ہو سکے۔

میں نے لوگوں کو شاہ جی کی تقریر سننے کے لیے اس طرح ٹولیاں بنا کر جلسہ گاہ کی طرف جاتے دیکھا ہے کہ جس طرح لوگ عموماً عید کی نماز پڑھنے جایا کرتے ہیں۔ میں بھی اپنے بچپن ہی سے ہمیشہ ان ٹولیوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے بچپن سے تقریریں سننے کا شوق بہت زیادہ تھا۔ اور خصوصاً عطاء اللہ شاہ صاحب کی تقریر کے لیے تو میرے والد اور بھائی صاحب بھی ضرور جاتے تھے۔ مختلف مشاہیر ملت کی تقریروں میں شامل ہونے کی عادت تو مجھے اپنے والد صاحب ہی سے ملی ہے جو خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، سید داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چوہدری افضل حق، شیخ حسام الدین، مظہر علی اظہر، تاج الدین انصاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی تقریروں اور مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کے مناظروں میں ضرور شامل ہوتے رہے ہیں۔

میں ذاتی طور پر ان میں سے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی جوہر اور چوہدری افضل حق مرحوم کی تقاریر سے محروم رہا ہوں۔ میں نے جس شخصیت کی تقریریں زیادہ سنی ہیں وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ گویا اس سلسلے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد لاہور میں شاہ جی کی جس قدر تقریریں ہوئی ہیں میں شاید ہی کسی تقریر سے غیر حاضر رہا ہوں گا۔

شاہ جی کی ہر تقریر کے موقع پر بلا مبالغہ اگر لاکھوں نہیں تو کئی ہزار لوگ تو ضرور موجود ہوتے تھے اور انکی تقریر جتنی دیر تک رہتی سامعین نہایت ذوق و شوق سے ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ شاہ جی کی تقریر کے موقع پر رات کے تین تین چار چار بجے تک تو میں بھی جاگتا رہا ہوں۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب میں لڑکپن کی

منزلیں طے کر رہا تھا۔ نہ جانے ان کی زبان میں کیا سحر اور دلکشی تھی کہ حاضرین میں سے نہ کسی کو نیند محسوس ہوتی تھی اور نہ کوئی ایک لمحے کے لیے اکتاہٹ محسوس کرتا تھا۔

اگر تقریر کو جادو کہا جا سکے تو بلاشبہ شاہ جی بہت بڑے "جادوگر" تھے۔

میرے والد مکرم شیخ عبدالعزیز امرتسری اس واقعے کے راوی ہیں کہ ایک مرتبہ امرتسر میں کنھیا لال کے منڈوے میں مرزا بشیر الدین محمود کی تقریر تھی۔ شہر کے اکثر مولویوں نے مسلمانوں کو وہاں جانے سے روکا۔ چنانچہ مرزائیوں کے علاوہ وہاں شاید بہت ہی کم لوگ گئے۔ ابا جی کہتے ہیں میں نے سوچا کہ دیکھوں تو سہی مرزا محمود آخر کہتے کیا ہیں۔ جب تقریر کا وقت ہوا اور مرزا صاحب نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر الحمد کی تفسیر بیان کرنا شروع کی تو نہ جانے اچانک عطاء اللہ شاہ بخاری کہاں سے نکل آئے اور انہوں نے للکار کر کہا کہ مرزا صاحب آپ قرآن کی تفسیر تو غلط نہ کیجئے۔ مرزا صاحب عطاء اللہ شاہ کو دیکھ کر سخت گھبرائے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے اس جگہ کو بہت محفوظ سمجھ کر وہاں آئے تھے۔

وہاں اس وقت محمد اعظم تھانیدار اور عزیز دین کو توال حفاظت پر متعین تھے۔ انہوں نے سرخ سرخ آنکھیں دکھائیں لیکن شاہ جی ان باتوں سے کب ڈرنے والے تھے۔ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ آخر لوگوں نے مرزا صاحب کو شاہ جی سے مناظرہ کرنے کو کہا۔ لیکن مرزا نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر کوتوال اور تھانیدار نے شاہ جی سے کہا۔

شاہ جی! مرزا صاحب آپ کے ساتھ مناظرہ کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا ہے۔ اب ہم آپ سے صرف یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کو یہاں سے جانے دیجئے وہ اب یہاں تقریر بھی نہیں کریں گے۔ شاہ جی کہا۔

"کیسے جانے دوں اگر اس میں جرأت ہے تو سامنے کھڑے ہو کر بات کرے"

اس کے بعد شاہ جی سینما ہال کے باہر آ گئے۔ وہاں اتفاق سے ایک تانگہ کھڑا تھا۔ شاہ جی نے اس پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی۔ اور آن کی آن میں سارا بازار ایک جلسہ گاہ بن گیا۔

دیکھا جائے تو شاہ جی کا یہ جذبہ، جرأت اور دلیری محض تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں تھی۔

شاہ جی اپنی رائے کے اظہار میں بڑے بیباک تھے۔ وہ بڑے بڑوں کے منہ پر بھی حق گوئی سے باز نہ آتے۔

"بعض لوگ معترض ہیں کہ آجکل اسلامی نظام فٹ نہیں بیٹھتا" پھر سمجھانے کے لئے ایک مثال پیش کی کہ ایک ماہر درزی نے جسم کے اعضا اور تناسب کا لحاظ رکھتے ہوئے قمیض تیار کی پہننے والے کو فٹ آ گئی۔ بعد میں اسے تشنج ہو گیا۔ اعضاء کا تناسب جاتا رہا۔ ایک ہاتھ آگے کو لمبا ہو کر اکڑ گیا۔ دوسرا پیٹھ کی طرف مڑ گیا۔ ایک ٹانگ ٹیڑھی اور دوسری چھوٹی ہو گئی۔ پیٹھ کبڑی اور چھاتی اندر کو دھنس گئی۔ ان حالات میں وہ قمیض میں عیب ڈھونڈتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہ فٹ نہیں اور پھر درزی پر بھی معترض ہے کہ اس نے صحیح نہیں بنائی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ قمیض فٹ نہیں کہ یہ منحوس خود ان فٹ ہو گیا ہے۔ تمہارے منہ کا ذائقہ صفراوی بخار سے تلخ ہو چکا ہے۔ تم کو میٹھی چیز بھی کڑوی لگتی ہے۔ یہ دوا اور غذا کا قصور نہیں۔ تمہارے منہ کے ذائقہ کی خرابی ہے۔ انسان اپنی فطرت کے مطابق رہنا اور جینا چاہے تو اسلام سے بہتر کوئی نظام حکومت اور ہدایت نامہ نہیں ہو سکتا۔

اور اگر کہیں مذہبی یا سیاسی اختلاف ہوتا تو لگی لپٹی رکھے بغیر نہایت واشگاف الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کر دیتے تھے۔

میرے والد صاحب ہی راوی ہیں کہ ایک دفعہ سخت سیاسی بے چینی کا دور تھا اور انگریزوں کے خلاف عوام کے جذبات بہت مشتعل تھے۔ شاہ جی اپنے مرشدِ اول پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (گولڑہ) کے پاس گئے اور ان سے جہاد کے موضوع پر گفتگو کی۔ پیر صاحب فرمانے لگے۔ "اچھا میں دعاء کروں گا۔

شاہ صاحب جو نہایت پُرجوش الفاظ لے کر وہاں گئے تھے یہ سن کر کہنے لگے۔

"سرکار! مجھے معاف کیجئے اگر ہر جگہ دعائیں ہی کافی ہوتیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بدر واحد کے میدانوں میں نہ جاتے۔

اسی طرح ایک مرتبہ مذہبی جلسہ ہو رہا تھا۔ مولانا نور احمد مرحوم (خطیب مسجد شیخ بڈھا) نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت کے بیان میں کہا کہ آپ ﷺ کو غصہ نہیں آتا تھا۔

ان کے بعد جب شاہ جی تقریر کرنے کو اٹھے تو کہنے لگے۔ میں مولانا (نور احمد مرحوم) کو اپنا استاد کہتا ہوں۔ لیکن یہاں شاگرد استاد سے اختلاف کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ نہیں آتا تھا۔ میں کہتا ہوں غصہ آتا تھا۔ وہ بشر تھے اور غصہ بشر کی فطرت ہے۔ انسان میں غصے کی غیر موجودگی اس کی غیرت کے منافی ہے۔ ہمیں اپنی محبت و عقیدت میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ انسان تھے اور انسانی تقاضے ان کے ساتھ تھے۔ اور یہی ان کی فضیلت ہے۔ کہ وہ انسان ہونے کے باوجود اس قدر بلند و بالا تھے۔

شاہ صاحب کی تقریر میں بعض اوقات بڑی دلچسپ اور معنی خیز لفظی رعایات بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ کہنے لگے۔

"جب کہیں بخاری کی تقریر ہو تو ان مرزائیوں کو نہ جانے کیوں بخار چڑھ جاتا ہے!

اسی طرح ایک اور موقع پر کہنے لگے۔

مجھے تو آج تک مرزا کی نبوت کے متعلق سمجھ نہیں آئی۔ یہ ظلی بروزی، برازی خدا جانے کیا ہے؟

ایک سیاسی جماعت کے مقابلے میں ایک بار کہا۔ ہم انکا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں نہ ہمارے پاس زر ہے نہ زور ہے اور نہ زور ہے!

شاہ جی نے اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہونے سے بہت پہلے امرتسر کے گول باغ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا تم لوگ خدا جانے کن خوش کن خوابوں میں کھوئے ہو۔ میں کہتا ہوں یہ وہ وقت ہے کہ میں مشورہ دوں گا۔

"سونا بیچو اور لوہا خریدو"

انکا مطلب تھا کہ اپنے دفاع کا بندوبست کرو۔ لیکن افسوس کہ عوام نے ان کے ان الفاظ کی قدر نہ کی۔

شاہ جی کی ایک تقریر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے موقع پر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے وسیع و

ایک دفعہ ہم چند ساتھی شاہ جی کی بیماری کے ایام میں دولت خانہ پر حاضر ہوئے تو احقر کے عرض کرنے پر کہ مزاج کیسے ہیں فرمایا اب تو خدا کا فضل ہے فلاں سنہ میں تکلیف زیادہ تھی۔ دن میں پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ دفعہ پیشاب آتا تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ نبی بنتے بنتے رہ گیا۔ سو دفعہ روزانہ سے کم پیشاب کرنے والا آج کل نبی نہیں ہو سکتا۔"

خوبصورت میدان میں ہوئی۔ جب شاہ جی جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو اللہ اکبر۔ تاج و تخت ختم نبوت۔ زندہ باد عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

لیکن جب صدر اجلاس میاں ممتاز دولتانہ تشریف لائے جو ان دنوں سابق پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے تو انہیں عوام کا یہ دلی تپاک نصیب نہ ہوسکا۔

شاہ جی نے دولتانہ کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مولانا احمد علی مرحوم شاہ جی کے بڑے مداح تھے۔

جن دنوں ختم نبوت کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور حکومت وقت اس تحریک کو دبانے میں مصروف تھی۔

مولانا احمد علی مرحوم نے خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا۔

حکومت کہتی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری فساد پھیلاتا ہے۔ ان بندوں کو یہ معلوم نہیں کہ اگر عطاء اللہ فساد پر آمادہ ہو جائے تو مرزائیت کا قلعہ تا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بخاری شام کو حکم دے دیں تو صبح ہونے سے پہلے پہلے ربوہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔

مجھے بتاؤ کہ ایک طرف لاہور کا ڈپٹی کمشنر تقریر کرے اور ایک طرف عطاء اللہ شاہ تقریر کرے تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے۔؟ اگر ایک طرف وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین تقریر کریں اور ایک طرف عطاء اللہ شاہ تقریر کریں تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟ اگر ایک طرف گورنر جنرل غلام محمد تقریر کریں اور دوسری طرف عطاء اللہ شاہ تقریر کریں تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟

اور مولانا احمد علی کے جواب میں لوگ ایک آواز کہہ رہے تھے

عطاء اللہ شاہ کو۔ عطاء اللہ شاہ کو۔

ان مثالوں سے مسلمانوں کے دلوں میں عطاء اللہ شاہ کی محبت و عقیدت کا اندازہ مشکل نہیں ہے۔

شاہ جی کا جسم بہت رعب دار اور مضبوط تھا۔ ایک بار تقریر میں انہوں نے بتایا کہ کسی زمانے میں میری صحت اتنی اچھی تھی۔ اور بازو اتنے موٹے تھے کہ میرے کوئی ہتھکڑی پوری نہیں آتی۔ چنانچہ انگریزی حکومت کو میرے لیے خاص طور پر الگ ہتھکڑیوں کا انتظام کرنا پڑا۔

بعض مذہبی مسائل میں انکی رائے نہایت واشگاف اور دو ٹوک ہوتی تھی۔ کچھ مثالیں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک مثال اور سنیئے۔

ایک مرتبہ امرتسر میں ایک پیر قسم کے مولوی آئے اور مسجد جان محمد میں یہ تقریر کر گئے کہ حضور ﷺ نوری تھے ان کو خاکی یا بشر کہنا انکی توہین ہے۔

شاہ جی نے مسجد خیر الدین میں اس کا جواب دیا اور کہا: بھائی مانو نہ مانو میرے نانا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہی تھے میں انکی اولاد میں شامل ہوں۔ سارے

ایک بار ارباب حکومت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ہم پر اعتماد کرو۔ اختلاف کا زمانہ گزر گیا ہے۔ اب اعتماد کے بغیر کام نہ چلے گا۔ مجھے اپنی بیوی پر اعتماد ہے کس اطمینان سے اسے گھر چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہ جو اپنی بیویوں کو بغلوں میں دبائے مال روڈ پر ساتھ پھرا رہے ہیں ان کو اعتماد نہیں ہے۔ سارا جلسہ زعفران بن گیا۔ (سابقہ تلخیوں کو ختم کرنے کا مخلصانہ مشورہ دیتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے لگے ہاتھوں دلدادگان تہذیب فرنگ کی تھوڑی بہت تادیب بھی فرما دی۔

سید انکی اولاد میں شامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور یہ عام بات ہے کہ نسل بدلا نہیں کرتی۔ انسان کی نسل ہی سے انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اگر میرے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بشر نہ تھے تو میں یہاں تک کہہ دوں گا کہ جو لوگ سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ کہاں سے آ گئے ہیں۔

میں نے شاہ جی کی آخری تقریر دہلی دروازے میں سنی جو شاید لاہور میں ان کی آخری تقریر تھی۔ اس تقریر سے پہلے ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور کچھ عرصے کے لیے افاقہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس تقریر کا بیشتر حصہ ایک خط پڑھنے اور اس پر تنقید کرنے میں گزر گیا۔ جو مرزا قادیانی نے انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے لکھا تھا اور وہ شاہ جی کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

جو شخص بیک وقت لاکھوں انسانوں کے کانوں کیا دلوں تک اپنی آواز پہنچا سکتا تھا۔ وہ اتنا بے بس تھا کہ دم آخر اپنے بیٹوں تک سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اس کیفیت کا مشاہدہ کر کے عرشی نے وہیں یہ شعر کہا:

برق ورعد آسودۂ بستر شدہ
شعلۂ جوالہ خاکستر شدہ

افسوس کہ وہ نادر روزگار شخصیت اب ہماری دنیا میں نہیں اور ہم ان کو اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔

وہ صورتیں الہیٰ کس دیس بستیاں ہیں
اب انکے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

سکوتِ انجمن

سکوتِ انجمنِ اہلِ دل ہے کس کا نقیب
نظر سے دور ہے، کوئی مگر ہے دل سے قریب
قضا کے ہاتھ نے چھینی ہے نُطق کی تاریخ
کہ انجمن سے اُٹھا عظمتِ وفا کا خطیب

لطیف انور

مستقبل کی تعمیر

"جو لوگ اقتدار نشین ہو کر اسلامی نظام کے قیام سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں اور عوام کو اپنی ذہنی اصلاح کے لئے کہتے ہیں وہ دراصل خود اسلام سے تہی داماں ہیں۔ جب سب کچھ اسلام کے نام حاصل کیا گیا ہے تو پھر اس سے انحراف کیوں۔؟

اسلام ایک آفاقی دین ہے، وہ اپنے اندر ایک ایسا نظام رکھتا ہے جو ازاوّل تا آخر اور تا بہ قیامِ قیامت ہر انسانی گروہ اور ہر انسانی جماعت کی خوشحالی و برتری کا ضامن ہے۔ وہ بنیادی سعادتوں کا توشہ ہے، اور ہم اس پر چل کر اپنے لئے، بنی نوعِ انسان کے لئے صحت مند مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں۔"!

خطاب : حضرۃ امیرِ شریعتہ سید عطاء شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ

۱۹۴۸ء لائلپور (فیصل آباد)

ایک بے مثال شخصیت

ملک امجد حسین ایڈووکیٹ

گزری ہوئی یاد کے دریچوں سے جھانکتا ہوں تو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور کو اپنے غریب خانہ (بٹالہ ضلع گورداسپور) کے ایک کمرہ میں بڑے بے تکلف انداز میں مصروف گفتگو پاتا ہوں۔ ملنے والوں کا جم غفیر اور شیداؤں کا ایک گروہ ان کے ارد گرد حلقہ کئے بیٹھا ہے کسی سے چھیڑ خانی کسی سے لطیفہ گوئی اور کسی سے سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ الغرض ان کی محفل رنگا رنگ کی خوبیوں کا مرقع ہوتی تھی۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو۔ کہ سر زمین بٹالہ نے احرار کی اٹھان و مضبوطی میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور ان کی سب سے پہلی کانفرنس کا انعقاد بھی وہاں ہوا تھا۔ بچپن کے زمانے کے تاثرات زیادہ اُجاگر ہو کر تو نہیں ابھر رہے لیکن اتنا یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات میں احرار کے امیدوار ایک خیال شخص محمد خان تھے۔ اور ان کا حلقہ نیابت تحصیل بٹالہ تھا۔ الیکشن کا مرکزی دفتر چونکہ بٹالہ تھا اس لئے شاہ جی کا قیام بھی وہیں تھا الیکشن مہم پر انکے ساتھ ایک دفعہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک گاؤں (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) میں جلسہ کا انتظام کیا گیا۔ جب شاہ جی مرحوم اسٹیج پر تقریر کے لئے تشریف لائے تو ان کے سامنے ایک چھوٹا سا بچہ ہاتھ میں جلتی بیٹری لئے بیٹھا تھا۔ چونکہ روشنی اُن کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس بچہ کو بیٹری گل کرنے کے لئے کہا۔ نامعلوم کیوں انتہائی کوشش کے باوجود بچہ بیٹری بجھانے میں کامیاب نہ ہوا۔ شاہ جی مرحوم اس کو دیکھ کر ہنسے اور پھر یقین جانیئے اسی غیر اہم واقعہ سے اپنی بے مثال تقریر کا موضوع تیار کر لیا۔ جب آخری بار بھی بیٹری بجھ نہ سکی تو

> **ایسے انسان یقیناً قوموں کی قسمت بدلتے ہیں اور ان کے عمل و کردار کی قوتوں سے تاریخ اپنے صفحات کی رنگینیوں کو دوبالا کرتی ہے**

انہوں نے فوراً کہا۔ او منڈیا تو بیٹری بالی اے تے بجھ دی نہیں۔ مرزے نے نبوت کیتی اے تے بجھ دی نہیں۔ (او بچے تو نے بیٹری جلائی ہے لیکن اب بجھ نہیں رہی۔ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے اور سے بجھایا نہیں جائے گا) شاہ جی کا دلفریب طرز بیان الفاظ کی روانی، زباں کا جادوں اور خیالات کا تسلسل فضاء میں ایک ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ سامعین کبھی قہقہوں کی دنیا میں آباد ہوتے،

اور کبھی آنسوؤں کی لڑیاں اُن کے رخساروں پر نظر آ جاتیں۔ میری آنکھوں سے وہ منظر اور دماغ سے وہ خیال آج تک اوجھل نہیں ہوسکا کہ برصغیر ہندو پاک کا یہ بے مثل خطیب کس طرح بے مطلب باتوں سے بے مثال تقریروں کے عنوان تیار کرتا۔ پھر ان کو جادو تاثر کے

اس مرد درویش نے اپنے آپ کو الاٹ منٹوں کی الائشوں سے بالکل مبّرا رکھا۔

الفاظ میں لپیٹ کر سننے والوں کی طرف اس اچھوتے انداز میں پھینک دیتا کہ ہر شخص استعجاب و قبولیت کی مکمل تصویر بن جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ عظیم انسان اگر چاہے تو انسانوں کے جم غفیر کو آگ کی لپیٹوں میں دھکیل دے۔ تو پھر بھی شکوہ و شکایت کی کوئی آواز بلند نہ ہوگی۔

میری عقل و سمجھ کی پرواز اس زمانہ میں بالکل محدود تھی۔ اور سیاسیات کے پیچ و خم کو سمجھنا میری ادراک سے باہر لیکن پھر بھی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ قدرت نے جو بے مثال صلاحتیں اس مرد حق کو دے رکھی تھیں۔ کسی میں نہ ہوں گی۔ اگر میں اس کو اس برا عظم کا مارک انتھنی کہہ دوں تو شاید پھر بھی ان ان کی خطابت و تقریر کی خوبیوں کا پورا پورا خاکہ پیش نہ ہو۔ ایسے انسان یقیناً قوموں کی قسمت بدلتے ہیں۔ اور ان کے عمل و کردار کی قوتوں سے تاریخ اپنے صفحات کی رنگینیوں کو دوبالا کرتی ہے۔ لیکن کیا مسلمان قوم نے اس مرد حق کو اپنی صفوں میں مناسب مقام دیا ہے؟

پاکستان کی تخلیق کے بعد وہ عملاً سیاست سے دست بردار ہوگئے تھے۔ اور اپنی تمام ذہنی و عملی قوتوں کو دفاع پاکستان کے لئے صرف کرنے کا عہد کر چکے تھے۔ لیکن کبھی کبھی بڑے دکھ اور درد کے ساتھ اس خیال کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ کہ پاکستان اسلام کے مقدس نام پر معرض وجود میں آیا ہے اس لئے تم کو دین حق کی سر بلندی کے کوشاں رہنا چاہیے اور ہمارے اعمال و کردار کے کسی پہلو سے اسلام کے مقدس دامن پر کوئی دھبہ نہیں آنا چاہیے۔ نہ معلوم! جو کچھ اس مردِ حق نے کہا تھا وہ کس حد تک قابل عمل سمجھا گیا ہے۔ ور دینِ حق کی اشاعت و ترویج کے لئے ہم نے کیا کیا ہے۔ مملکت خداداد اور پاکستان میں آنکھوں دیکھتے لوگ ترقی و کامرانی کے زینوں تک پہنچ گئے۔ سیم و زر کی جھلک نے اکثر

ایک دفعہ کئی دوست شاہ جی سے ملنے گئے تو اس وقت شاہ جی مرغوں کے لئے دانہ تیار کر رہے تھے۔ جناب مجاہد الحسینی نے از راہ تفنن عرض کی "شاہ جی آپ کس کام میں لگ گئے؟" شاہ جی فرمانے لگے۔ "بیٹا کیا بتاؤں۔ قوم کو زندگی بھر آواز دی۔ اسے پکارا حتیٰ کہ میرے بال سفید ہوگئے لیکن اس کے دل کی سیاہی دور نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار کر انسانوں سے منہ موڑ کر خدا کی دوسری مخلوق کی طرف ملتفت ہوا ہوں۔ یہ مخلوق ایسی ہے۔ کہ میری ادنیٰ پکار پر دیوانہ وار آتی ہے اتنے میں شاہ جی نے مرغیوں کو آ۔ آ۔ آ۔ کہہ کر بلانا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے تمام مرغیاں شاہ جی کے ارد گرد جمع ہوگئیں تو شاہ جی نے فرمایا۔ "بیٹا یہ ہے اطاعت و فرماں برداری کی مثال"

آنکھوں کو خیرہ کر دیا؛ مستحق اور غیر مستحق انسانوں نے دولت کے انبار لگا لیے [illegible] کا کاروبار کر کے چشم زدن میں لاکھوں پتی ہو گئے ہیں۔ اور اپنی فکر و ضمیر کی تمام روشنیوں کو معدوم کر دیا۔ وہاں اس مردِ درویش نے اپنے آپ کو الاٹ منٹوں کی آلائشوں سے بالکل مبرا رکھا اور حکومت وقت کی کسی قسم مراعات کو قابل قبول نہیں سمجھا۔ جب عظمت و جلالت کا یہ پیکر موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تو حکومت نے یہ تجویز کی کہ ان کی آخری آرامگاہ ملتان کے مشہور مقام قلعہ کہنہ قاسم باغ پر بنائی جائے۔ لیکن انکے وارثوں نے انکی وصیت کے مطابق اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کا اظہار کیا۔ اور برصغیر کے اس بطل جلیل کو جو آزادی و حریت کے لئے قید و بند کی تکالیف سے نہ گھبرایا اور کلمۂ حق تختہ دار پر بھی کہنے سے گریز نہ کیا عوام کی آغوش میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ کیونکہ قولاً و فعلاً وہ عوام کا بندہ تھا۔ اور اُس رسول کا نواسہ جس نے امیری پر غریبی کو، نخوت پر حلیمی کو، جلالت و تمکنت پر انکسار و عجز کو، بادشاہت پر فقیری کو اور انسانیت کو فرقہ بندی پر ترجیح دی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را



دیکھنا تقریر کی لذت

جناب اعجاز چشتی

سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میری پہلی ملاقات قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں راولپنڈی مدرسہ تعلیم القرآن کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہوئی۔ شاہ جی نے کمپنی باغ میں ایک بڑے اجتماع کو خطاب کیا۔ میں اس وقت گارڈن کالج راولپنڈی کا طالب علم تھا۔ تحریک پاکستان سے وابستگی کی وجہ سے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک مخصوص متعصبانہ نکتہ نگاہ کے جلسہ گاہ میں پہنچا۔ شاہ جی نے تلاوت قرآن پاک سے تقریر کا آغاز کیا۔ شاہ جی قرآن پڑھ رہے تھے، تو شورش کاشمیری کے بوئے گل، کے ان الفاظ پر یقین آیا۔

شاہ جی کے ان الفاظ نے قوت بخشی، میں نے تقریر کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے بارہا میں بڑے بڑے مجموں کو خطاب کر چکا تھا۔ گورداسپور اور دنیا نگر کے درودیوار آج تک گواہ ہیں کہ اس پندرہ سالہ مقرر نے دوستوں اور دشمنوں سے اپنی خطابت کی داد لی۔ لیکن اوکاڑہ کے جلسہ کی تقریر۔۔۔۔ رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر، صحت الفاظ کا خیال رکھتے ہوئے جاری رکھی جب میں اس مقام پر پہنچا کہ۔

"یہ ملک اسلام کے لئے حاصل کیا گیا ہے، یہاں اسلام ہی ہمارا ضابطہ حیات ہو گا۔ اور اسلام ہی کے لئے اس ملک کا تحفظ کرنا ہے۔

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

شاہ جی نے تقریر کی خوب داد دی۔ جنہوں نے شاہ جی کو کبھی داد دیتے دیکھا ہے وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کی اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اکثر

> **وہ نوجوان جو جدید تعلیم سے آراستہ ہیں اگر دین کی طرف آجائیں تو تبلیغ دین زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے**

کانفرنسوں میں شاہ جی کے ساتھ شریک ہوا اور خطاب کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آج میں جب سوچتا ہوں کہ شاہ جی ایسا عظیم خطیب اور مجھ ایسے نو آموز مقرر کی تعریف تو صحیح معنوں میں ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے میرے متعلق اکثر فرماتے کہ۔

"وہ نوجوان جو جدید تعلیم سے آراستہ ہیں، اگر دین کی طرف آجائیں تو تبلیغ دین زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ ہم مولویوں نے دین کو محفوظ رکھا کیا یہی کم ہے، اب تم لوگ اسے سنبھالو اور دور دور تک پہنچا دو؟"

۱۹۵۳ء کے بعد ناگزیر وجوہات کی بنا پر شاہ جی

سے ملاقات نہ کر سکا۔ وقفہ زیادہ ہو گیا۔ اس لئے جاتے ہوئے ڈرتا کہ شاہ جی ناراض ہوں گے، نہ ملنے کا کیا جواز پیش کروں گا۔ لیکن حافظ لدھیانوی جو ان دنوں ملتان میں تھے سے معلوم ہوا کہ جب بھی میرا ذکر آیا۔ بڑے درد کے ساتھ فرماتے کہ۔

"اعجاز ایک عرصہ سے نہیں ملا۔ نہ جانے مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے؟"

میں شاہ جی کی خدمت میں حق نواز خاں قمر کی معیت میں حاضر خدمت ہوا۔ اس طرح پیش آئے جس طرح

"شاہ جی قرآن پڑھ رہے ہوں تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے قرآن نازل ہو رہا ہو اور وقت ٹھہر گیا ہے۔"

شاہ جی کا موضوع تھا دینی مدارس اور انکی خدمات، پہلی بار مجھے ان دینی مدارس اور علماء کی خدمات کا صحیح شعور پیدا ہوا، تقریر میں وہ جادو تھا کہ میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ دوسری صبح شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا، موضوعِ سخن کے لئے میں نے جرأت کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

شاہ جی نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ دین و سیاست کی جدائی کا ذکر تاریخی واقعات کی روشنی میں اس طرح کیا کہ خلافت راشدہ سے سقوطِ بغداد کی پوری تاریخ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ حاضرین مجلس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ بوڑھا انسان اپنے خدا کے کس قدر قریب ہے؟ اور اپنے نانا کا کس قدر وجمیع حلقہ بگوش ہے۔ کہنے لگے بھائی میں نے کتابیں نہیں پڑھیں انسانوں کو پڑھا ہے۔ میں مولانا سید انور شاہ، مولانا حسین احمد مدنی، حکیم محمد اجمل، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد کے قافلہ سے بچھڑا ہوا ایک راہی ہوں۔ جو اس بڑھاپے میں بھی منزل مقصود کی طرف چلا جا رہا ہوں، سب ساتھی ایک ایک کر کے چھوٹ گئے۔

۱۹۵۱ء میں احرار دفاع کانفرنس اوکاڑہ میں مولانا محمد علی جالندھری کی دعوت پر شریک ہوا۔ آخری اجلاس جس کو شاہ جی نے خطاب کرنا تھا۔ مولانا محمد علی جالندھری

پاکستان بن جانے کے بعد راولپنڈی میں کسی دینی جماعت کا جلسہ تھا۔ شاہ جی اس جلسہ میں مدعو تھے۔ تب مرحوم راجہ غضنفر علی صاحب جو اس وقت کرسیٔ وزارت پر متمکن تھے اور اس جلسہ کے صدر بھی تھے۔ انہوں نے شاہ جی کو تقریر کی دعوت دیتے ہوئے طنزاً کہا کہ شاہ جی جس لیگ کے مخالف تھے اسی لیگ نے انہیں پناہ دی ہے۔"

غیور سید یہ بات کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ چنانچہ اٹھتے ہیں جواب دیا۔

"ہاں بھائی! یہ پناہ آج سے نہیں مل رہی۔ اس کی بڑی لمبی تاریخ ہے میرے ابا کو بھی پٹنے کے بعد تمہارے ابا کے گھر میں پناہ ملی تھی۔

شاہ جی کا یہ کہنا تھا کہ مجمع میں سناٹا چھا گیا۔ غضنفر علی خاں نے گردن جھکا دی بخاری پیکر جلال و غیرت بنا ہوا تقریر کرتا رہا۔

یوسف غیور و فطرت یوسف غیور
کیا اعتبارِ خوابِ زلیخا کرے کوئی

کے حکم سے مجھے بھی تقریر کرنا پڑی۔ شاہ جی کی عظمت اور ان کی شخصیت کا رعب سامنے تھا۔ عرض کیا کہ شاہ صاحب کی موجودگی میں میرے لئے تقریر کرنا مشکل ہے۔

شاہ جی نے فرمایا۔

"بھائی میری عظمت یہ نہیں کہ اپنے بھائیوں میں خوف و ہراس پیدا کروں، میری موجودگی نے بہروں کو کان دیئے۔ گونگوں کو قوتِ گویائی بخشی، لنگڑوں کو چلنا سکھا دیا۔ میں باعث زحمت نہیں، باعث رحمت بنا ہوں۔ تم تقریر کرو، میں سنوں گا"



شاہ جی نے زندگی بھر کسی کی غیبت نہیں کی اور ان کا مسلک پردہ پوشی تھا۔

ایک بار شاہ جی سے ایک مشہور غزل گو شاعر عبدالحمید عدم جو اپنی شراب نوشی کے لئے مشہور ہیں، مل کر گئے تو حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ:

"شاہ جی آپ تو شرابیوں کو بھی منہ لگا لیتے ہیں۔"

شاہ جی فرمانے لگے کہ

"بھائی تم نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے۔؟"

اس شخص نے کہا

"نہیں۔"

فرمانے لگے۔

پھر غیبت کیوں کرتے ہو؟"

ایک دوسرے صاحب درمیان میں بول اٹھے۔

"شاہ جی میں نے اسے شراب کے نشے میں بدمست دیکھا ہے"

فرمانے لگے۔

"پھر پردہ پوشی سے کام لو۔"

ہزار رحمتیں ہوں اس مردِ درویش پر۔۔۔ انکے اس طرز عمل سے بہتوں نے اصلاح پائی اور دشمن دوست بن گئے۔

شاہ جی دین و سیاست کے علاوہ شعر و ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ شعر فہمی کا جو ملکہ انہیں حاصل تھا۔ وہ اکثر اہل فن کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ایک عمدہ شعر ان پر کیف و سرور کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ بقول حافظ لدھیانوی:

"شاہ جی شعر کی داد یوں دیتے تھے، کہ آنکھوں کی بناوٹ اور ہونٹوں کی سجاوٹ شعر کے حسن کا پتہ دیتی تھی، شعر کے معنی انکے چہرے پر بکھر جاتے تھے۔"

مختلف مدرسہ ہائے فکر کے شعراء کا شاہ جی سے عمر بھر گہرا رابطہ رہا۔ اختر، تاثیر، سالک، فیض، ساحر لدھیانوی اور حافظ لدھیانوی انکی صحبت میں بیٹھنا سعادت خیال کرتے تھے۔ شعراء ان کی داد کو آج تک بطور سند پیش کرتے ہیں۔ شاہ جی خود شاعر تھے ان کے کلام کا

شاہ جی اپنے اکابر کی طرح انگریز کی دھوکہ و چال باز فطرت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے انگریز کی فطرت کا خمیر سانپ کے زہر سے اٹھایا گیا ہے۔ اور اپنی غذا کے لئے انسانی خون کی جو چاٹ پڑی ہوئی ہے بڑی مشکل سے چھوٹے گی۔"

مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ شعراء کا کلام اپنی تقریروں میں اس طرح استعمال کرتے، گویا یہ اشعار انکی نوکِ زبان تھے۔

ایک حقیقی باپ اپنے گم شدہ بچے کو پا کر خوش ہوتا ہے۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن ایک جملہ ایسا نہ کہا جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں قصوروار ہوں۔ بار بار یہ مصرعہ دہراتے رہے۔

مجھ کو تو تم پسند ہو، اپنی نظر کو کیا کروں

اور یہی کہتے رہے کہ بھائی اکثر سوچتا کہ مجھ سے کیا قصور ہوا جو تم ملاقات سے گئے۔۔۔۔ یہ بات صرف میرے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی، بلکہ ہر ملنے والے دوست کے ساتھ ان کا یہی حسن سلوک تھا۔ دوسری طرف استغناء کا یہ عالم کہ پاکستان کے ایک سابق صدر نے اپنے زمانۂ صدارت میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح شاہ جی سے ملاقات کرے۔ لیکن شاہ جی اس کے پاس جانے کو تیار نہ ہوئے اور نہ اس بات پر آمادہ ہی ہوئے کہ وہ ان کے ہاں خود آکر مل لے فرماتے تھے۔

"مجھ فقیر سے صدر مملکت کا کیا کام ہے، اگر جماعتی بات ہے تو صدر مجلس سے کی جائے"

شاہ جی بعض اوقات ایک ہی جملہ میں ایسا نکتہ بیان کر جاتے جو ہزاروں تحقیقی کتابوں پر حاوی ہوتا

ایک دفعہ لائل پور سے چند مل والے شاہ جی سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ شاہ جی چند عام ساتھیوں سے محو گفتگو تھے۔ سلسلہ کلام جاری رہا۔ چند منٹ بعد ایک ساتھی نے کہا کہ شاہ جی یہ فلاں مل والے ہیں اور آپ سے ملنے آئے ہیں۔ "شاہ جی نے برجستہ فرمایا کہ۔

"بھائی کسی دل والے کی بات کرو، مل والے مجھ فقیر سے کیا لینے آتے ہیں۔"

شاہ جی بعض اوقات ایک ہی جملہ میں ایسا نکتہ بیان کر جاتے جو ہزاروں تحقیقی کتابوں پر حاوی ہوتا۔ "مل والے اور دل والے" اس ایک جملہ میں کیا کچھ نہیں کہہ گئے۔ اسی طرح ایک دفعہ قیام پاکستان سے قبل اسلامیہ کالج کے چند طلباء شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں داڑھی کا ذکر آگیا۔ شاہ جی کٹر قسم کے مُلّاں نہ تھے۔ ایک طالب علم نے کہا:

"شاہ جی آج کل کالجوں میں داڑھی رکھنا مشکل ہے۔"

شاہ جی فرمانے لگے کہ

"ہاں بھائی! خالصہ کالج میں داڑھی رکھنا آسان ہے اور اسلامیہ کالج میں مشکل ہے۔"

شاہ جی کے بد ترین دشمنوں کو بھی اقرار ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ابھی وہ نسل زندہ ہے جس نے شاہ جی کی خطابت کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ انکی خطابت کا موضوع آزادی، احیائے دین اور تحفظ ختم نبوت تھا، بولتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ شاہ جہان کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے یا ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ انکی موجودگی میں کسی دوسرے مقرر کا چراغ نہیں جلا، خود مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر ان کی عظمت کے معترف تھے۔ تقریر کرتے تو سارے مجمع پر چھا جاتے اور میر کے اس شعر کی مجسم تصویر بن جاتے۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
اور مستند ہے میرا فرمایا ہوا
ان کی باتیں دلوں میں اتر جاتیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے کیا خوب کہا ہے۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں



ہمارے جیل خانے

ہمارے جیل خانے مجرموں کو مزید مجرم بناتے ہیں یہاں اصلاح احوال کی توقع ہی عبث ہے جو خرابیاں ایک اخلاقی قیدی کو جیل خانے میں سوجھتی اور سجھائی جاتی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ ایک طرف خطرناک جرم پرورش پاتے ہیں، دوسری طرف سزا کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ (سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

تیرا اندازِ سُخن یاد آیا

ملک اسلم حیات سابق صدر بار ایسوسی ایشن لاہور

وہ ہستیاں الہیٰ کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

تقسیم ملک سے پہلے ایک دن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے اچانک لحن داؤدی میں بلند آواز سے یہ شعر پڑھنا شروع کیا۔

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا
مَے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے کے رووے گا

حاضرین جھوم اٹھے اور اس تصور میں کھو گئے کہ واقعی جب شاہ صاحب داغ مفارقت دے جائیں گے تو دنیا کی رنگینیوں پر کیا اثر پڑے گا۔

اب جب کہ تصور حقیقت میں ڈھل گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب دنیا سے اٹھ جانا۔

عجب کچھ سانحہ سا ہو گیا ہے!

وہ مرد درویش جس کی ایک کڑک نے بڑے بڑے سرکشوں کو جھکا دیا۔ جس کی حق گوئی اور بیباکی کے آگے سلطنت برطانیہ کی طاغوتی طاقت نہ ٹھہر سکی۔ جس کے زمزمے فضاؤں میں تیزی سے گونجے۔ جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس پر ہر مکتبۂ خیال کے لوگوں نے آنسو بہائے۔

والٹیر کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ اپنے بستر میں چھینکتا تھا تو یورپ کے تخت لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ یہی شاہ صاحب کا حال تھا کہ انکے نام سے برطانوی سامراج لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

شاہ صاحب کی خدمت میں جو کوئی ایک بار حاضر ہوا وہ ہمیشہ کے لیے انہی کا ہو گیا۔ میں جب پہلی مرتبہ شاہ صاحب سے ملا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے شاہ صاحب سے میری پرانی جان پہچان ہے۔ کوئی بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک اور دوست نے شاہ صاحب سے پہلی ملاقات کے بعد بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا
آج تک تیری جدائی میں یہ کیونکر گزرا

یہ شاہ صاحب کا کمال تھا کہ وہ پہلی نظر میں گھائل کر لیتے تھے۔ اور پھر دل یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ ان سے کبھی علیحدگی اختیار کی جائے۔

انسان خواہ کتنا ہی بہادر ہو، کتنا ہی شہزور ہو موت کا سرد اور بے رحم ہاتھ اسے وقت موعودہ پر آدبوچتا ہے۔ وہ ہستی جس نے سر سے لے کر پیر تک زندگی کی ساری عمارت اپنے ہاتھ سے کھڑی کی، جس نے اس عمارت کی ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھ سے چنی جس نے بادشاہوں کو دعوت مبارزت دی تھی۔ جس نے وقت کے فرعونوں کو للکارا جو باطل کے خلاف صف آرا ہوا، جب موت اس کے پاس آئی تو وہ اس کے سامنے جھک گیا دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ شاہ صاحب کی بیماری کی خبریں کئی ماہ سے سن رہے تھے۔ آخر وہ گھڑی آ گئی جب وہ عظیم شخصیت ہم

سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ اب اس کی یاد باقی ہے۔ اس کے معرکوں کی گونج تاریخ کے صفحات میں سنی جائے گی۔ اس کی عظیم خطابت کے قصے لوگوں کی زبانوں پر رہیں گے۔ اس کی بہادری کی داستانیں ضرب الامثال بنیں گی۔ مگر جس نے دنیا کو اتنا کچھ دیا اس کی زندگی ہمیشہ دکھی رہی۔ وہ جن کے لیے لڑتا رہا۔ انہوں نے وقت کی مصلحتوں کا ساتھ دیا اور اس کے نقش قدم پر چلنے سے انکار کر دیا۔ مگر ایک دن آئے گا جب مؤرخ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے گا۔ اور پھر معلوم ہو گا کہ بخاری کے دل میں قوم کے لیے کتنا درد تھا اور وہ جو کچھ کہتا تھا اس میں کتنا خلوص تھا۔

حضرت شاہ صاحب کو خداوند کریم اعلیٰ علیین میں جگہ دے ان کے مزار مقدس پر اپنے انوار برسائے کہ انہوں نے اپنی زندگی قوم پر نثار کی۔ (یہ مضمون شاہ صاحب کی وفات کے چار روز بعد لکھا گیا)

بہ شکریہ ہفت روزہ چٹان لاہور ۱۹۶۲ء



دعاء

ایک دفعہ شاہ جی دعاء مانگ رہے تھے کہ دروازہ پر مانگنے والے نے صدا دی تو اپنے خالق حقیقی سے مخاطب ہو گئے۔ کہا کہ میں تیرا سائل ہوں اور یہ تیرے بندوں کا سائل ہے۔"

عقیدہ

شاہ جی ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کا اظہار یوں فرماتے تھے۔

خدا کی عبادت، رسول کی اطاعت اور انگریز سے بغاوت یہ میرا ایمان ہے اور رہے گا۔ خدا معبود ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب اور انگریز مغضوب۔ خدا کو جو جی چاہے کہو اس کا محاسبہ خود کرے گا مگر محمد کے متعلق سوچ لینا یہ معاملہ عقل و خرد کا نہیں ہے عشق کا ہے اور عشق پر زور نہیں ہوتا نہ اپنے پر اختیار، پھر یہ نہیں سوچا جائے گا کہ قانون کیا کہتا ہے۔ پھر جو ہونا ہو گا ہو جائے گا اور جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

با خدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار

محاسبہ

جن دنوں مدح صحابہ اور تبرا ایجی ٹیشن کا زور بندھا ہوا تھا۔ شاہ جی نے دہلی دروازہ کے باہر ایک عظیم اجتماع سے خطاب کیا مدح صحابہ کرنے والو! خدا کے خوف سے ڈرو!

شاہ جی سے ایک ملاقات

سید نذیر احمد شاہ بخاری

اگر انسانی خواہشات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو مشہور اور عظیم شخصیتوں سے ملنے کی خواہش ایک امتیازی مقام کی حامل نظر آئے گی۔ ہر باشعور اور صاحبِ ذوق آدمی چاہتا ہے کہ وہ بڑے آدمیوں سے ملاقات کرے اور اگر ملاقات کے مواقع میسر نہ آئیں تو کم از کم ان صاحبِ عظمت انسانوں کو ایک نظر دیکھ ہی لے۔ اس بات سے انسانی خواہشات کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان اہل عظمت بزرگوں کی بڑائی جھلکتی ہے۔ جو اپنی پروقار سیرت کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

مجھے بھی حضرت شاہ صاحب کو زندگی میں صرف ایک دفعہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور میں اپنے ایک دوست حافظ عبید الرحمن کے ساتھ جب شاہ صاحب کے مکان پر گیا تو چٹائی پر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اور شاہ صاحب کے دہن مبارک سے چند کلمات کو نہایت آہستگی کے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت شاہ صاحب اپنے معیار کے مطابق ... نہ تھے اور وہ نحیف آواز کے ساتھ تخاطب فرماتے تھے۔ شاہ صاحب کی اس حالت کو دیکھ کر مجھے محلے کے ایک شخص کے وہ الفاظ یاد آ گئے جنہیں وہ شاہ صاحب کو یاد کر کے اکثر دہرایا کرتا تھا۔ الفاظ تھے۔

"کیا کوئی ماں عطاء اللہ شاہ جیسا لال جنے گی۔؟

ہرگز نہیں!

شاہ صاحب نے اپنی شفیق نظروں کو میری طرف موڑا اور میرے دوست سے میرے متعلق دریافت کیا۔ اور چند لمحوں کے بعد میری حیثیت کالج کے ایک طالب علم کی سی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاہ صاحب کچھ طنزیہ انداز میں مجھے نشانۂ ہدف بنائیں گے۔ اور مجھے انگریزی تعلیم کی علامت سمجھ کر اپنی شکایت کو الفاظ کا جامہ پہنائیں گے۔

لیکن یہ گمان ایک خیال خام کی صورت میں میرے دماغ میں کچھ دیر جلوہ گر رہ کر اپنی موت آپ ہی مر گیا۔

مجھے مذہب سے بچپن سے ہی لگاؤ رہا ہے لیکن جب میں اپنے مذہب کی علامتوں میں وہ خصوصیات نہیں پاتا جو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ ہونا چاہئیں تو مجھے ایک رنج اور قلق محسوس ہوتا ہے۔ شاہ صاحب سے نہ تو میں نے اپنے متعلق کوئی شکایت سنی اور نہ ہی اس رنج و قلق نے مجھ میں جنم لیا۔

دراصل عظیم انسانوں کا ظرف بہت وسیع ہوتا ہے ہر چیز کے دونوں پہلوؤں سے آگاہ ہو کر ذمہ دارانہ طریقے سے اظہار خیال کرتے ہیں اور داڑھی دیکھ کر "ملّا" اور داڑھی نہ دیکھ کر ملحد نہیں پکارنے لگتے۔ وہ زندگی کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور اپنے تجربات کی بنا پر اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالیں تو وہ جواہر سے زیادہ بے بہا ہوتا ہے۔ اور شخصیات کی

غیر موجودگی میں ان الفاظ ہی لو تو میں اپنے نئے قندیلِ راہ تصور کرتی ہیں۔ شاہ صاحب کے قریب بیٹھنے سے کم از کم مجھ پر وہ خوف طاری نہیں ہوا تھا جو آج کل کے صاحبِ مذہب لوگوں کے پاس بیٹھ کر بعض حالات میں ہو جاتا ہے ان کی باتیں سنکر ہی دل ان کی عظمت و شفقت کا اعتراف کر رہا تھا۔ اور اس مجلس میں وہ بات نظر آ رہی تھی جو اقبال کے خیال میں مردِ قلندر کی بارگاہ میں اکثر ملتی ہے۔

دراصل شاہ صاحب کی ذات کے لوگ اتنے گرویدہ جو ہو گئے تھے اس کی ایک وجہ تو ان کی وہ خطیبانہ صلاحیتیں تھیں۔ جن کو مذہب کی محبت نے جلا بخشی تھی۔ اور دوسرا وہ خلوص تھا جو شاہ صاحب کی زندگی کے دینی و دنیاوی معاملات میں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے ان شعروں میں شاہ صاحب کی پر کشش ذات کی تصویر جھلکتی ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

پہلا مصرع ان کی تمام سیاسی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے جو تمام تر انگریز کے خلاف گزری۔ عوامی زندگی میں چوتھا مصرع انکے حُسنِ خُلق کی عکاسی کرتا ہے۔

شاہ صاحب کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل تھے۔ ان کی باتیں دلفریب اور نگاہیں دلنواز تھیں۔ اپنی تمام زندگی میں وہ اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

لیکن افسوس کہ شاہ صاحب کے پروردہ لوگوں میں شاہ صاحب کی ایک بھی صفت تخلیق کے مراحل طے نہ کر سکی، ورنہ اسلام کی نئی شان اور نئی آن ہوتی۔





شاہ جی! اشتراکیت کا جب ذکر فرماتے تو کہا کرتے تھے کہ کمیونزم باہر سے نہیں آیا یہ اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ بدن میں میل کچیل ہو تو جوئیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارا نظام صحیح اور اسلام کے مطابق ہو تو پھر کمینہ ازم کی گنجائش نہیں رہتی"

شاہ جی کی باتیں

منظور احمد بھٹی۔ بی اے ایل ایل بی سیالکوٹ

غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے میں ابھی چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ ملک میں انقلابی نعرے بلند ہو رہے تھے۔ میں بھی ان نعروں کے مطالب سے بالکل بے خبر اپنے ہمجولیوں کے ساتھ مل کر انقلاب زندہ باد اور انگریز مردہ باد کے نعرے بلند کرتا رہتا۔ انہیں دنوں سہ روزہ احرار کانفرس کا اعلان ہوا۔ اور کانفرنس سے ایک روز پیشتر پتہ چلا کہ "بابا ڈنڈے والا" سیالکوٹ پہنچ گئے ہیں۔ اور عبدالرحیم گاندھی کے مکان پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔

شوق زیارت ہمیں کشاں کشاں درِ یار کی جانب لے گیا وہاں جا کر ایک وجیہ و شکیل انسان دنیا بھر کا جاہ و جلال اور حسن و جمال سمیٹے، لہراتی ہوئی زلفوں، گھنی اور خوبصورت داڑھی کے ساتھ اور چہرۂ روشن پر برکاتِ الٰہی کا نور لیے نظر آیا۔

دریافت پر معلوم ہوا کہ یہیں شاہ جی ہیں۔ شاہ جی اس وقت نہا رہے تھے۔ جب غسل سے فارغ ہوئے تو آپ نے سفید قمیض اور ایک سیاہ تہبند زیب جسم کر لیا۔ پاس ہی قبلہ شیخ حسام الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ مسکرا کر پوچھا۔

شاہ صاحب! یہ دورنگی کیسی؟

شاہ جی نے برجستہ جواب دیا "ارے بھائی دل کی سیاہی نیچے اتر گئی اور ایک زوردار قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔

تشکیل پاکستان سے پیشتر چونڈہ ضلع سیالکوٹ کی انجمن تبلیغ الاسلام کے سالانہ جلسے تاریخی نوعیت کے ہوا کرتے تھے ہندوستان بھر کے جید علماء کرام ان جلسوں سے خطاب کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ اور ہمارا جنون بھی ہمیں اپنی پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر چونڈہ جانے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں بھی حسب معمول سالانہ کانفرنس بڑے ٹھاٹھ باٹھ اور دھوم دھام سے ہوئی۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں شاہ جی کی تقریر تھی۔ تقریر سے پیشتر اسٹیج پر چونڈہ کا ایک متمول سکھ وزیر سنگھ مع اپنے دس خاندان کے افراد کے شاہ جی کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور عرض کیا گیا:

شاہ جی وزیر سنگھ اور اسکے اہل و عیال آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہونا چاہتے ہیں۔

شاہ جی نے آہ بھر کر کہا: بھائی مجھے تو اتنا پتہ نہیں کہ میں بھی مسلمان ہوں یا نہیں، آئیے پہلے دیکھیں کہ مسلمان ہوتا کیا ہے؟ اس کے بعد خطبۂ مسنونہ پڑھا اور پھر صبح کے تین بجے تک "مسلمان کیا ہے؟" کے عنوان پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی۔

تقریر کے بعد وزیر سنگھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اب بتاؤ مسلمان ہونا چاہتے ہو؟

وزیر سنگھ۔۔۔ جس کے دل و دماغ میں اسلام کی

حقانیت کی شمع روشن ہو چکی تھی آنسوؤں کے دئیے روشن کر کے بولا ہاں شاہ جی اب میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ شاہ جی نے وزیر سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کلمۂ شہادت پڑھایا اور عبداللہ نام تجویز کیا۔ اسی وقت اس کے خاندان کے دس افراد بھی مسلمان ہوئے۔ اور جلسہ نو مسلمین کے لیے دعاء استقامت کے ساتھ ختم ہو گیا۔ دوسری صبح چونڈہ کے دیگر ۵۴ افراد بھی شاہ جی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

ایک دفعہ دفتر احرار میں بیٹھے تھے، کھانے کا وقت آ گیا۔ اسی وقت بھنگی بھی کہیں سے آ ٹپکا۔ شاہ جی نے کہا میاں کھانا کھا لو، خدا آپ کو زیادہ دے۔ یہ بھنگی کا جواب تھا۔ شاہ جی اٹھے، بھنگی کو غسل خانے میں لے گئے، اس کا ہاتھ منہ دھلایا اور پھر اپنے ساتھ ہی بٹھا کر کھانا کھلایا۔

آہ، کتنا عظیم انسان تھا!

ایک زمانے میں مجھے بڑے لوگوں سے انکے دستخطوں کے ساتھ کوئی پیغام لینے کا بڑا شوق تھا۔ اس مقصد کے لئے میں نے ایک بڑی خوبصورت کاپی بنا رکھی تھی۔

شاہ جی دفتر احرار میں محفل جمائے بیٹھے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کاپی ان کے آگے بڑھا دی۔ دیر تک کاپی کی تعریف کرتے رہے اور مسکرا کر فرمایا: کیوں میاں، یہ مجھے تحفہ دے رہے ہو۔۔۔؟

عرض کیا: شاہ جی اس پر آپ اپنے قلم سے کچھ لکھ دیں۔ فرمایا: نہ بھئی، اتنی خوبصورت کاپی میں کیوں خراب کروں

شاہ جی! یہ اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ آٹو گراف بک ہے۔

شاہ جی ذرا غصے میں آ گئے۔ فرمایا وہی انگریزی بدعت اور اس کے ساتھ ہی کاپی مجھے واپس لوٹانے لگے۔

دوبارہ عرض کیا: شاہ جی اس پر اپنی طرف سے کوئی پیغام لکھ دیجئیے۔

فرمانے لگے میں کیا اور میرا پیغام کیا، پیغام لانے والا تیرہ سو برس پیشتر جو پیغام لایا تھا اس پر تم لوگ کیا عمل کر رہے ہو، اسی پیغام کو سمجھو اور اسی پر عمل کرو۔ دنیا و عقبیٰ سنوارنے کے لیے وہی کافی ہے۔

کراچی ختم نبوت کے دفتر میں شاہ جی صبح کی نماز کے بعد وظیفے میں مصروف تھے کہ اتنے میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم اور مجید لاہوری مرحوم تشریف لائے۔ سالک صاحب نے آتے ہی حملہ کیا:

برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر!

شاہ جی نے وظیفہ ختم کرنے کے بعد فرمایا: سالک صاحب آپ نے بڑے موقع کا مصرع پڑھا ہے اس وقت میرے دل میں آپ دونوں ہی کا تصور تھا۔

ایک دفعہ شاہ جی سیالکوٹ میں ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ عقیدت مند دیوانوں کی طرح جمع تھے۔ بات حقوق اللہ اور حقوق العباد پر چل نکلی۔ اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے۔

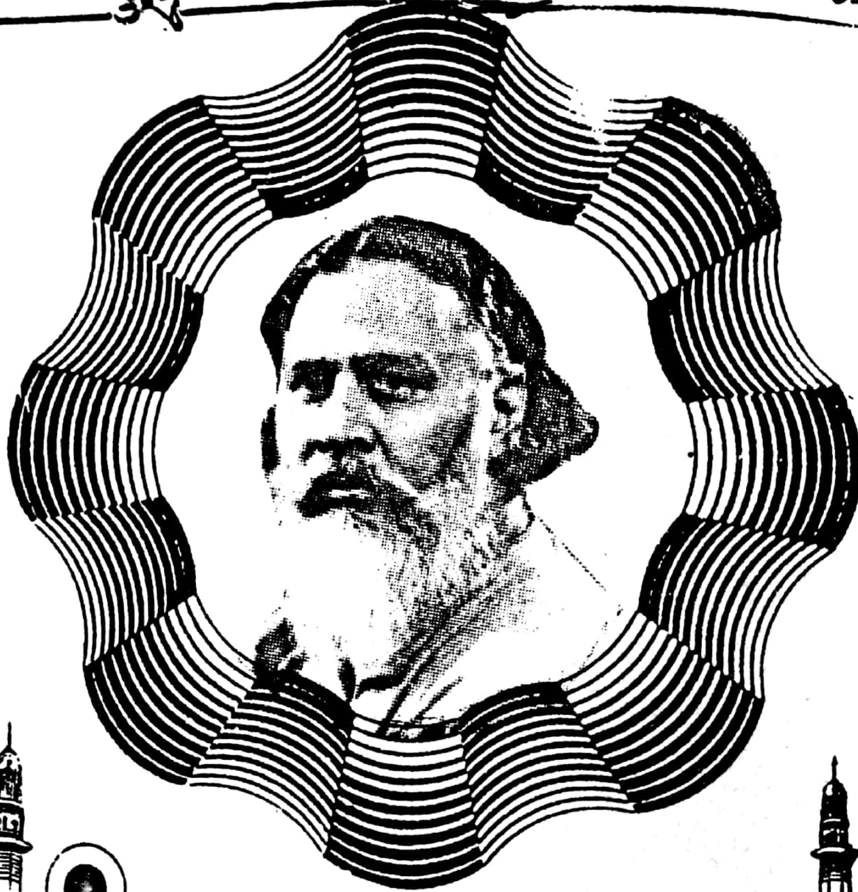
یاد رکھو اگر میں حقوق اللہ میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہوں تو کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی طرف سے مجھے معاف کر دے۔ اسی طرح اگر میں کسی انسان کو دکھ دوں تو خدا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ میری یہ غلطی معاف کر دے جب تک وہ انسان جس کے ہاتھوں مجھے یہ دکھ پہنچا ہے وہی معاف نہ کر دے!

سیالکوٹ تشریف لائے ہر عقیدت مند کی خواہش تھی کہ شاہ جی میرے ہاں قیام کریں۔ شاہ جی نے دفتر ہی پسند کیا۔ دن بھر محفل جمی رہی۔ رات کو دفتر ہی میں بستر لگا دیا گیا۔ شاہ جی نے چارپائی پر بستر لگا دیکھا تو اٹھا دیا۔

عرض کیا: شاہ جی بستر ہی پر سو رہئے

فرمایا: کل جیل میں یہ نرم و گرم بستر پہنچا دو گے؟
عرض کیا گیا: حضور اگر آپ حکم دیں گے تو وہاں بھی پہنچا دیں گے۔
فرمایا! پھر قبر میں بھی پہنچا دو گے؟

اللہ! اللہ یہ تھے شاہ جی!
ہمارے شاہ جی!
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!



عظمت کے مینار

شاہ جی نے ایبٹ آباد (ہزارہ) میں تقریر کی اور جب واپس آنے لگے۔ تو آپ کے میزبان نے جیب میں کچھ سکے ڈال دیئے۔ جب آپ سٹیشن پر پہنچے اور ٹکٹ لینے لگے تو دیکھا کہ وہ تمام تر سکے کھوٹے تھے شاہ جی نے ہنس کر فرمایا کوئی بات نہیں ایسے کھوٹے مرید بھی تو ہوتے ہیں۔

دوسرے سال جب دوبارہ اسی آدمی نے آپ کو دعوت دی تو مولانا محمد علی جالندھری نے اشارہ کیا۔ "شاہ جی یہ وہی آدمی ہے۔" اس پر شاہ جی نے کہا اگر ہم کھوٹے اور کھرے پیسوں میں پڑ گئے تو ہماری اور اس کی ذہنیت میں کیا فرق رہ جائے گا۔

قافلہ سالارِ خطابت

زاہد عباسی لائلپوری

رات کے دو بج چکے تھے۔ کافی ہاؤس میں ابھی زندگی کی ہما ہمی جاری تھی۔ فٹ پاتھ پر کرسیاں بچھائے کچھ لوگ مذہبی مسئلوں پر بحث کر رہے تھے۔ گیلری میں چند صحافی صبح کی خبروں پر تبصرہ کرنے میں مصروف تھے۔ جونہی میں کافی ہاؤس میں داخل ہوا میری نظر میز پر پڑے ہوئے ایک مقامی اخبار پر جا پڑی۔

پہلی خبر جس پر میری توجہ منعطف ہوئی "امیر شریعت کی موت" کی خبر تھی۔ میں اخبار لے کر ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ اور زندگی کے تلخ حقائق کے متعلق سوچنے لگا۔ ذہن کے پردے پر یادوں کے دھندلے سے نقوش ابھرنے لگے۔ اپنے مکان کی چھت پر "سرخ پھریرے" کا ہلکا سا عکس دکھائی دیا اور پھر اپنے بچپن کی وہ گھڑیاں یاد آنے لگیں۔ جب احرار رضا کاروں کے ساتھ قدم ملانے کی سعی کیا کرتا تھا۔

احرار کے اس بوڑھے جرنیل سے میری عقیدت قدرتی تھی۔ اس میں نہ کسی بڑے فلسفہ داں کو دخل ہے نہ کسی مذہبی آمر کو۔ اور میری اس عقیدت کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مجھ سے نہیں چھین سکتی۔

۱۹۲۹ء میں مجاہدین اسلام کی اٹھنے والی تحریکیں جنہوں نے برطانوی سامراج سے ٹکر لی۔ ان میں شاہ صاحب پیش پیش تھے۔ اور پھر جب احرار رضاکار برطانوی استعمار سے ٹکرا گئے۔ تو وہ

نغمۂ حب وطن سولی پہ گایا جائے گا!

کی زندہ تصویر تھے۔

حتیٰ کہ جب ۱۹۴۷ء کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا تو ہندوستان سے برطانوی استعمار کا سورج غروب ہو گیا۔ شہنشاہیت کے ان حامیوں کو جن کا سورج روئے زمین پر غروب نہیں ہوتا تھا۔ اپنے چھوٹے سے ملک میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔

برطانوی سامراج کی لعنت ہندوستان سے ختم کرنے میں شاہ صاحب کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ اور ان کے اس کردار کی بدولت ہر شخص غیر متعصبانہ طور پر یہ شعر پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسے لوگ بھی اس جہاں میں ہوتے ہیں
ستارے ٹوٹتے ہیں جن کی جستجو کے لئے

شاہ صاحب اگر چاہتے تو غداران ملک و ملت کی طرح جاگیروں کے مالک بن سکتے تھے۔ مگر میری قوم کے اس مجاہد نے ضمیر کے خلاف کام کرنے میں عار محسوس کی۔ ضمیر کی موت انسانیت کی موت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے قوم کو گرداب میں

پھنسی ہوئی کشتی کو کنارے پر لانے کی جدوجہد کی اور اس میں وہ کافی سے زیادہ کامیاب بھی رہا۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں جمال الدین افغانی کے بعد صحیح معنوں میں ایک یہی مجاہد تھا جو برطانوی استعمار سے ٹکرایا۔

شاہ صاحب کی سب سے پہلی تقریر میں نے دھوبی گھاٹ لائلپور کے وسیع پنڈال میں سنی تھی۔ اس وقت شاہ صاحب کافی سن رسیدہ تھے۔ اس کے برعکس خطابات میں وہی بجلی کی سی تیزی موجود تھی۔ آپ گزشتہ نصف صدی کی تاریخ دہرا رہے تھے۔ ہنسانے پر آتے تو گھنٹوں ہنساتے رہتے۔ اور جب آپ گزشتہ ٹوٹے ہوئے بربط کے تاروں کو چھیڑتے تو سامعین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اور ان کی نظروں کے سامنے پانچ دریاؤں کی

پاک سرزمین آجاتی جس پر کبھی ہندوستان کے رانجھے ہیروں کی یاد میں بنسری کی لے پر ہجر و وصال کے نغمے چھیڑا کرتے تھے۔

شاہ صاحب متعدد بار گرفتار ہوئے اور جیل پہنچے۔ جیل میں بھی اپنے مقصد کو نہ بھولتے بلکہ قیدیوں کو توحید و رسالت کا سبق دیتے رہے۔ آپ کی باغ و بہار طبیعت جیل کو گلستان بنا دیتی۔ ادبی ثقافتی۔ سیاسی محفلیں جمتیں۔ مشاعرے ہوتے۔ قوالیاں ہوتیں اور جیل کی زندگی کا طویل عرصہ گزارتے ہوئے تکلیف محسوس نہ ہوتی۔ اور جب آپ رہا ہو کر آتے تو اکثر لوگ آپ کو یاد کرتے رہ جاتے۔ جس نے ایک دفعہ بھی آپ سے ملاقات کی وہ آپ کا گرویدہ ہو کر آپ کی شخصیت و کردار سے بے حد متاثر ہوتا۔ اور ہمیشہ کے لئے آپ ہی کا ہو کر رہ جاتا۔

آپ خود کہتے تھے:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنئیے گا
کہتے کسی کو سنئیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

اور ان کے اس قسم کے الفاظ میرے ذہن کو اتھاہ غم کی گہرائیوں میں پھینک دیتے ہیں کہ آہ اب یہ مردِ مجاہد ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گا۔

اور پھر سوچتا ہوں کہ قدرت کا یہی قانون ہے اور ازل سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ بڑے لوگ اپنی یادوں اور اپنے عقیدت مندوں کو روتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر پھر دوسرا خیال آتا تھا کہ احرار کا یہ بوڑھا جرنیل ابھی ہمیں روتا ہوا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ قدرت اتنی ستم گر نہیں کہ ابھی ہم سے اس مجاہد کو چھین لے۔

شاہ صاحب نے کہا تھا دنیا میں مجھے ایک چیز سے محبت ہے وہ ہے قرآن اور دنیا میں مجھے ایک چیز سے نفرت ہے وہ ہے انگریز۔

شاہ جی فرمایا کرتے تھے۔ "کہ ہمارے ہاں نوجوانوں کا عجیب مزاج ہو گیا ہے۔ بلکہ فطرت۔۔۔۔ جو لڑکا میٹرک فیل ہوتا ہے باٹا شوز کمپنی میں سیلزمین ہو جاتا ہے۔ یا سی۔ آئی ڈی کے ملائکہ مقدسین کا انفارمر بن کر ٹاپتا پھرتا ہے۔

شاہ صاحب اپنے اس قول کو صداقت میں انگریز کے مظالم سے نہیں ڈرے۔ بلکہ ببانگ دہل

اس کے خلاف میدان جنگ میں آئے۔ جسے دنیا متحیر ہو کر دیکھتی رہ گئی۔ ایسا مجاہد ہم سے ہمیشہ کے لیے نہیں چھن سکتا۔ کہ ہم اس کے نقش قدم پر زندگی کے سانچے کو ڈھالیں۔ اور ظلم کو جہاں بھی ابھرتا ہوا محسوس کریں اس کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ حتیٰ کہ انسان کو اس تاریکی سے روشنی میں لے آئیں۔ وہ روشنی جو کہ سرکار مدینہ کے سبز گنبد سے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے سینوں میں اجالا کئے ہوئے ہے۔

قادیانیت ہمیشہ سے شاہ صاحب کا محبوب موضوع رہا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر آپ فتنے کے خلاف لڑے ہیں۔ یہ فتنہ جس کا پودا انگریز کے ایماء پر ہندوستان کی سرزمین پر اس لیے بویا گیا تھا تاکہ ہندوستان کا مسلمان متحد نہ ہوسکے۔

شاہ صاحب کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن سے بے پناہ عشق تھا اس لیے انہوں نے ختم نبوت کی تحریک کو شروع کیا آج انہیں ہم سے جدا ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے مگر لگتا ہے وہ جیسے جلسہ عام سے اب بھی خطاب فرما رہے ہیں۔ مگر نہیں یہ میرا وہم ہے۔ ایسے لوگ دوبارہ نہیں آتے۔

نظریہ

شاہ جی کا نسب نامہ حریت ولی اللہیٰ خاندان سے ملتا تھا۔ ان کے دل میں بھی کفر اور کفار کے خلاف جہاد کی اور عشق رسول کی وہی آگ بھڑک رہی تھی۔ جس کو ولی اللہیٰ خاندان نے سلگایا تھا۔ اور جس نے سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کو لیلائے شہادت سے ہم کنار کیا۔

بجرم عشق توام می کنید غوغایست
تو نیز برسر بام آکہ خوش تماشایست

محفلِ بخاری کے چند لمحات

شریف شوق امرتسری

شہید گنج بھی ٹیشن عروج پر تھی انگریز مجلس احرار ایسی فعال جماعت کو ہمیشہ ہمیشہ ختم کرنے کے لئے مختلف محاذوں پر، عیاری، اور ریشہ دوانیوں کے بم برسا رہا تھا۔ مجلس احرار چاروں اطراف سے مصائب و آلام میں مبتلا تھی۔ دفتر احرار جہاں ہزاروں روپے تبلیغ اور مقابلہ مرزائیت کی خاطر ہر وقت جمع رہتے تھے۔ وہاں ہر کارکن کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔

چودہری افضل حق مرحوم کی تحریک پر شاہ جی کو ڈابھیل جہاں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم خطیب تھے۔ بھیجنے کا پروگرام مرتب ہوا۔ اور شاہ جی کی معیت میں خاکسار کو جانے کا حکم ہوا۔ ڈابھیل میں ہفتہ عشرہ قیام کے دوران قریباً چھ سات تقریریں شاہ جی کی ہوئیں۔ اور کچھ رقم جمع ہوئی۔ واپسی پر شاہ جی امرتسر اترے۔ اور میں لاہور احرار کے صدر دفتر پہنچا۔ چودہری صاحب مرحوم نے دریافت فرمایا کوئی چندہ ہوا۔ میں نے عرض کی ہاں لیکن وہ ٹرنک جس میں رقم تھی شاہ جی امرتسر اپنے ساتھ لے گئے ہیں، مجھے وہ روپیہ لانے کے لئے امرتسر بھیجا گیا شاہ جی کے گھر پہنچا آواز دی۔ آواز پہنچاتے ہی اندر سے فرمانے لگے بھئی جلدی آؤ۔ ہم ساری رات سوئے نہیں۔"

میں نے عرض کیا کیا ہوا؟ فرمایا میری بیوی کو رات خواب آیا ہے کہ ہمارے صحن میں پاخانے کے ڈھیر لگا ہوا ہے۔ تین بجے رات سے اس وقت تک ہم میاں بیوی پریشان ہیں کہ ایسا خواب کیوں آیا اور ہمارے گھر میں یہ ڈھیر کیا؟ ایسا معلوم ہوا کہ چندہ کی رقم قوم کی امانت تھی۔ جو ہمارے گھر میں پڑی تھی۔ اسے لے جاؤ اور میری پریشانی کو دور کرو۔ چنانچہ میں رقم لے کر روانہ ہوا اور شاہ جی نے خدا کا شکر ادا کیا۔

کوئٹہ برباد ہو چکا تھا۔ تباہ شدہ، خانماں برباد زخمی بیمار مسلمان دھڑا دھڑ لاہور پہنچ رہے تھے۔ شمالی ہندوستان میں مہاجرین کوئٹہ کی سب سے زیادہ موثر اور ٹھوس خدمت مجلس احرار نے کی۔ لاکھوں روپے نقد تقسیم کئے گئے۔ دہلی دروازہ کے باہر زخمیوں اور بیماروں کے لئے کیمپ کھول دیئے گئے۔ جہاں ہزاروں زخمی اور مریض ہر وقت موجود رہتے تھے بیوگان۔ یتیمی، مفلوک الحال مسلم مہاجرین کوئٹہ کی کماحقہ، خدمت کی گئی یہاں تک کہ مجلس احرار کے شدید دشمن انگریز پر بھی اس بے لوث خدمت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس وقت کے انگریز وائسرائے نے مجلس احرار کو چٹھی لکھی کہ حکومت آپ

> **کمینوں کی ہم نشینی آورہ کتوں کی قے چاٹنے کے برابر ہے۔**

کی اس خدمت خلق سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ اس لئے مجلس احرار کے تین چار معتبرین دہلی کے قصر حکومت میں پہنچو۔ تاکہ ہم مجلس احرار کا شکریہ ادا کریں۔" اس پر فیصلہ کرنے کے لئے مجلس احرار کی میٹنگ ہوئی جس میں فیصلہ کیا جانا تھا کہ وائسرائے کے پاس شکریہ وصول کرنے کے لئے کس کس صاحب کو منتخب کیا جائے۔ اتنے میں شاہ جی تشریف لے آئے۔ بات سن کر فرمایا۔

"خدا کا خوف کرو۔ غضب خدا کا قوم ہماری، ملک ہمارا، خدمت ہماری اور شکریہ ادا کرے گورنر جنرل۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ملک اور قوم کا مالک انگریز ہے۔ اور انگریز ہماری خدمت کے صلہ میں ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ظالم فرنگی بڑا چالباز ہے۔ بے ایمان ہے یہ شیطان کا بچہ ہے۔ دوسری دنیا میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی فعّال جماعت مجلس احرار

لوگ کتابیں پڑھتے ہیں اور میں انسان پڑھتا ہوں۔

بھی انگریز کو ملک کا صحیح حاکم اور مالک تصور کرتی ہے۔"

شاہ جی کی گونج سے تمام حاضرین دم بخود ہو گئے۔ اور وائسرائے کو یہ جواب دیا گیا۔ کہ ملک ہمارا ہے۔ قوم ہماری ہے جس کی ہمنے خدمت کی ہے تمہارے شکریہ کے کیا معنی؟

فرمایا۔۔۔ جو لوگ بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے میری دعوت پر کسی تحریک یا مرحلہ میں موت کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کے خون کا ذمہ دار میں ہوں میں اللہ سے انکی مغفرت کے لئے دعاء کرتا ہوں۔۔۔ اگر انکا خون دشمنوں کی داستان سرائی کے مطابق رائیگاں گیا ہے تو اسکے ایک ایک قطرہ کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے تحریک استخلاص وطن اور ناموسِ رسول ﷺ کی حفاظت کے لئے اتنے مسلمان اور نوجوان مروائے اور جیل میں بھجوائے ہیں کہ ہر نقصان کی مسئولیت قبول کرتے ہوئے مجھے اطمینان ہوتا ہے۔

فرمایا۔۔۔ کمینوں کی ہم نشینی آوارہ کتوں کی قے چاٹنے کے برابر ہے۔ فرمایا۔۔۔ میں نے دلّی کی جامع مسجد اور لاہور کی شاہی مسجد میں نماز پڑھنے سے حتی الامکان گریز ہی کیا۔ کیونکہ غلامی کے زمانے میں مجھے یہ خلش مضطرب رکھتی ہے کہ آزادی انسانوں کی بنائی ہوئی سجدہ گاہوں کو اپنے غلام وجود کے سجدوں سے مجروح کیوں کروں؟ مجھ سے نہ کبھی دلّی کے لال قلعہ کی بے بسی دیکھی گئی ہے اور نہ میں نے انگریزوں کے زمانہ میں لاہور کے قلعہ کو آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے انکا لٹا ہوا طنطنہ مجھے غلاموں کے حق میں اکثر بد دعاء دیتا ہوا نظر آیا ہے۔

فرمایا۔۔۔ لوگ کتابیں پڑھتے ہیں اور میں انسان پڑھتا ہوں۔ میں نے تمام عمر انسانوں کو چہرے پڑھے۔ ان کی پیشانیوں سے مضمون چنے اور ان کے کانوں میں شہد و شکر کے قطرات ٹپکائے ہیں۔

فرمایا۔۔۔ جی چاہتا ہے سناٹوں میں چلا جاؤں اور وہاں اپنی للکار کو لٹاتا رہوں۔ اندھیروں میں نکل جاؤں اور وہاں اپنی آنکھوں کے نور چھڑکتا رہوں لیکن میں ان لوگوں میں عمر گزار رہا ہوں۔ جن کے ہاں دولت کی پوجا ہوتی ہے۔ اور طاقت کو سجدے کئے جاتے ہیں۔

فرمایا۔۔۔ اگر میں زندہ رہا تو پاکستان کی سرحدیں پکار اٹھیں گی کہ۔۔۔ بخاری اور اس کے سپاہیوں کو اس مٹی کے ذروں سے کہاں تک وابستگی و شیفتگی ہے۔





ساری کائنات کالی کملی والے آقا کے لیے آئی اور اس سے پہلے آئی۔ مگر موجود کملی والا آقا سب سے پہلے تھا۔ میں نے جو یہ مثال پیش کی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں یا نبی بننا چاہتا ہوں۔ مجھے تو یہاں ولی اور ولایت پر بھی اعتبار نہیں۔ نبی اور نبوت

کہاں۔ یہ اس لیے میں نے کہا کہ آج منٹ منٹ بعد قدم قدم پر برسات کے کیڑوں کی طرح سرکاری نبی اور سرکاری ولی پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ کوئی مجسٹریٹ نبی ہے کوئی سرکاری وکیل نبی ہے۔ کہیں اسکول ٹیچر ولی ہے کہیں سرکاری وزیر ولی ہے۔ سرکاری منڈی میں خداؤں نبیوں اور ولیوں کی عام کثرت ہو گئی۔ اور خدا کی نبوت اور ولایت سستے بھاؤ بکنے لگی۔

جب ہماری سرکار ہندوستان میں آئی تو نبوت اور ولایت بھی ساتھ ہی آ گئی۔ ارے تم کفر کے غلبے میں نبوتوں اور ولایتوں کے دعوے کرتے ہو، مجھے تو ایمان بھی نظر نہیں آتا۔ نبوتیں اور ولایتیں کہاں۔ ڈپٹی کمشنر انگریز کے اور ولایت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ ملازم کفر کے اور ولایت خدا کے پیغمبر کی۔ توبہ توبہ! اللہ بچائے۔ تم قرآن کو مانو نہ مانو میں تو قرآن سنانے آیا ہوں۔ اطاعت کفر کی غلامی کفر کی فیصلے کفر کے اور حکومت کفر کی۔ اللہ اللہ دین کہاں سے کہاں پہنچا۔ ولایت کے معنی سنگت کے ہیں۔ ولی اللہ کا سنگی رفیق۔ یہ ولایت اچھی ہے جو کفر کے نیچے دبی ہے۔ دھیان میری طرف کرو میں نے ۲۵ برس وعظ بیٹھ کر نہیں کیا۔ اب بیماری کے سبب کھڑے ہو کر مجھ سے وعظ نہیں ہو سکتا۔ مجھے تمہیں قرآن کی آیات سنانی ہیں اور ان کا مطلب تمہیں سمجھانا ہے کہ قرآن کا مقصد کیا ہے۔

خدا نے قرآن میں مقام ابراہیم کے متعلق فرمایا کہ خانہ کعبہ میں جس طرح کھڑے ہو کر ابراہیم خلیل اللہ نے دیواریں بنائیں اس کو نماز کی جگہ بناؤ۔ ابراہیم اس وقت اپنے مقام پر موجود نہیں ہیں کھڑے نہیں ہیں صرف [illegible] نشان موجود ہے جہاں انکے قدم مبارک ٹک گئے ہیں [illegible] اللہ کے برکات و انوار بھی وہیں ہیں جہاں ابراہیم کا نشان ہے نماز کی جان وہاں ہے۔ عجز و انکساری [illegible] خداوندی کی اصل وہاں ہے۔ اسلام کا منبع وہاں ہے وہاں انوار و تجلیات اور خدا کی رحمتیں و برکتیں لامحدود وسیع اور بے حساب ہیں۔ مقام ابراہیم اتنا برکت والا مقام ہے [illegible] وہاں ایک سیکنڈ میں قبولیت ہو جاتی ہے، جس جگہ اللہ کا پیارا ابراہیم کھڑا ہوا وہاں انوار و برکت اور رحمتیں ۴ ہزار سال سے برس رہی ہیں۔ حالانکہ وہاں نہ ابراہیم موجود ہیں اور نہ اب کھڑے ہیں تو جس مدینے کی خاک پاک میں وہ کالی کملی والا آقا محمد مصطفیٰ حبیب خدا ساڑھے تیرہ سو سال سے محو استراحت ہے وہ زمین مقدس کس قدر خدائی انوار

> **آپ نے کبھی یہ سوچا کہ قرآن کے نزول کا مقصد کیا ہے جس کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں۔**

و تجلیات اور اس کی رحمتوں اور برکتوں سے معمور ہو گی۔ اگر ۴ ہزار برس بعد بھی مقام ابراہیم پر نزول رحمت ہو سکتا ہے تو ساڑھے تیرہ سو برس بعد بھی (روضۂ نبوی پر) نزولِ رحمت ہو سکتا ہے مدینہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزار پر جاؤ وہاں حاضری دو درود و سلام پڑھو، دعائیں مانگو اللہ قبول کرے گا۔ وہ سر زمین مقدس انوار و برکات والی ہے حقیقت یہ ہے جہاں اللہ کے پیارے ہوں وہاں برکات

طرز خطابت، طریق خطابت

مولانا ابوالکلام کی انشاء اور شاہ جی کی خطابت میں واضح تفاوت کے باوجود ایک گونہ مماثلت ہے۔ مولانا کی تحریروں میں عبارت کے ہر موڑ پر اساتذہ کے اشعار نگینے کی طرح جڑے ہوئے ملتے ہیں۔ شاہ جی کی تقریروں میں برجستہ شعر اس طرح وارد ہوتے ہیں کہ ان کی چمک دمک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مولانا اپنی تحریروں کو قرآن مجید کی آیات سے مرصع فرماتے ہیں۔ شاہ جی تقریروں میں ہیرے کی طرح ٹانکتے ہیں۔

اقسام خطابت

آج خطابت کئی شکلوں میں بٹ گئی ہے۔ انگریزی ادب میں اس کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ عوامی خطابت
۲۔ پارلیمانی خطابت
۳۔ مباحثاتی خطابت
۴۔ ضیافتی خطابت

لیکن بعض مشرقی نقاد اس میں مزید تنوع اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔

اولاً: علمی مقرر، جو علم و نظر اور فلسفہ و فکر کے مسائل پر بولتے ہیں۔

ثانیاً: ادبی مقرر، جن کا میدان شعر و ادب تک محدود ہوتا ہے۔

ثالثاً: سیاسی مقرر، جو موقتہ سیاسی مسائل پر سوچ بچار کا ذہن تیار کرتے ہیں۔

رابعاً: پارلیمانی مقرر، جو دستوری مقرروں ہی کی توأم شاخ ہیں اور جن کی تگ و دو کا میدان مجالس مقننہ میں ہے۔

خامساً: ضیافتی مقرر، جو کلام بعد از طعام کے مظہر ہوتے ہیں۔

سادساً: عوامی مقرر، جو سیاسی تحاریک پیدا کرتے اور عوام "کالانعام" میں وحدتِ خیال پیدا کر کے اُنہیں حرکت و عمل کی راہ پر لاتے ہیں۔

سابعاً: مذہبی مقرر جنہیں واعظ بھی کہا جاتا ہے، ان لوگوں کا دائرہ بیان دینیات کے ایمانیاتی پہلو تک محدود ہوتا ہے۔

شاہ جی دستوری مقرر تو قطعاً نہیں لیکن دوسری تقریباً تمام خصوصیتوں میں سر برآوردہ ہیں۔ اس سارے دور میں ان سے بڑا عوامی خطیب ناپید ہے۔ جو چیز خطابت میں مقدم سمجھی جاتی ہے، وہ آواز ہے اور آواز بھی سانچے میں ڈھلی ہوئی پاٹ دار۔ دوسرا درجہ زبان میں مہارت کا ہے۔ شاہ جی قدرت کے ان دونوں تحائف سے بہرہ ور ہیں۔

ان کی آواز میں گھن گرج کے علاوہ ایک سج دھج ہے۔ انکے گلے کی غرریاں ساؤنڈ مشین کی طرح کام کرتی ہیں۔ انہیں الفاظ کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ آواز کے نشیب و فراز کا محلِ استعمال معلوم ہے۔

خطیب کے خصائص

جن لوگوں نے خطابت کے اصول مُدوّن کیے ہیں، ان کے نزدیک ایک خطیب کی بنیادی خصوصتیں یہ ہیں۔

۱۔ بے ریا کردار: جس سے خطیب کی شخصیت ترکیب پاتی ہے۔
۲۔ نصبُ العین: جس سے جماعت میں وحدت فکر پیدا ہوتی ہے۔
۳۔ صداقت شعاری: جس پر سامعین ہمہ تن گوش ہوتے ہیں۔
۴۔ اخلاص: جس سے زورِ بیان نکھرتا ہے۔
۵۔ وجاہت ذاتی: جس سے عوام مرعوب ہوتے ہیں۔
۶۔ باخبر ذہن: جس سے مقرر کا اعتماد بڑھتا ہے۔
۷۔ اشارات: جو الفاظ کے سفیر ہو کر انکی طاقت میں تائیدی اضافہ کرتے ہیں۔
۸۔ مرتب آواز: جس کا خطابت سے وہی رشتہ ہے جو سورج سے کرنوں کا ہے۔
۹۔ صحیح تلفظ: جس سے خطابت کی خوب صورتی مرجھاتی نہیں۔
۱۰۔ محل شناسی: جس سے خطابت کی عظمت بڑھتی ہے۔
۱۱۔ فہم عامّہ: جس سے خطابت کی ہڈی مضبوط ہوتی ہے۔
۱۲۔ مطالعہ: جس کے بغیر خطابت محض ایک آواز ہے۔
۱۳۔ مشاہدہ: ہم اسے خطابت کی بینائی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

اور یہ تمام خصوصیتیں شاہ جی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے خطبا کے ان اوصاف کو مرتب کیا، ان کی نظریں بے شبہ بڑے بڑے مقرروں کے احوال و وقائع پر تھیں۔

خطابت کے اجزائے ترکیبی

۱۔ سلاست: جس سے آواز میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔
۲۔ مستعدی: جس کا دوسرا نام برجستہ گوئی اور حاضر جوابی ہے۔
۳۔ مزاح: جس سے طبیعتوں کی تھکاوٹ رفع ہوتی ہے۔
۴۔ تجربہ: جس سے قوتِ بیان مضبوط ہوتی ہے۔
۵۔ تمثیلات: جس سے دلائل کو تقویت پہنچتی ہے۔
۶۔ تکنیک: جس پر خطابت کے مؤثرات کا انحصار ہے۔
۷۔ دعویٰ: جس کے بغیر خطابت میں یقین پیدا نہیں ہوتا۔

۸۔ اشارات: جنہیں الفاظ و مطالب کی امدادی سپاہ بھی کہا جاتا ہے۔

۹۔ استدلال: جس کے بغیر خطابت الفاظ کا نقار خانہ ہے۔

۱۰۔ اسلوب: خطابت کا پیراہن۔

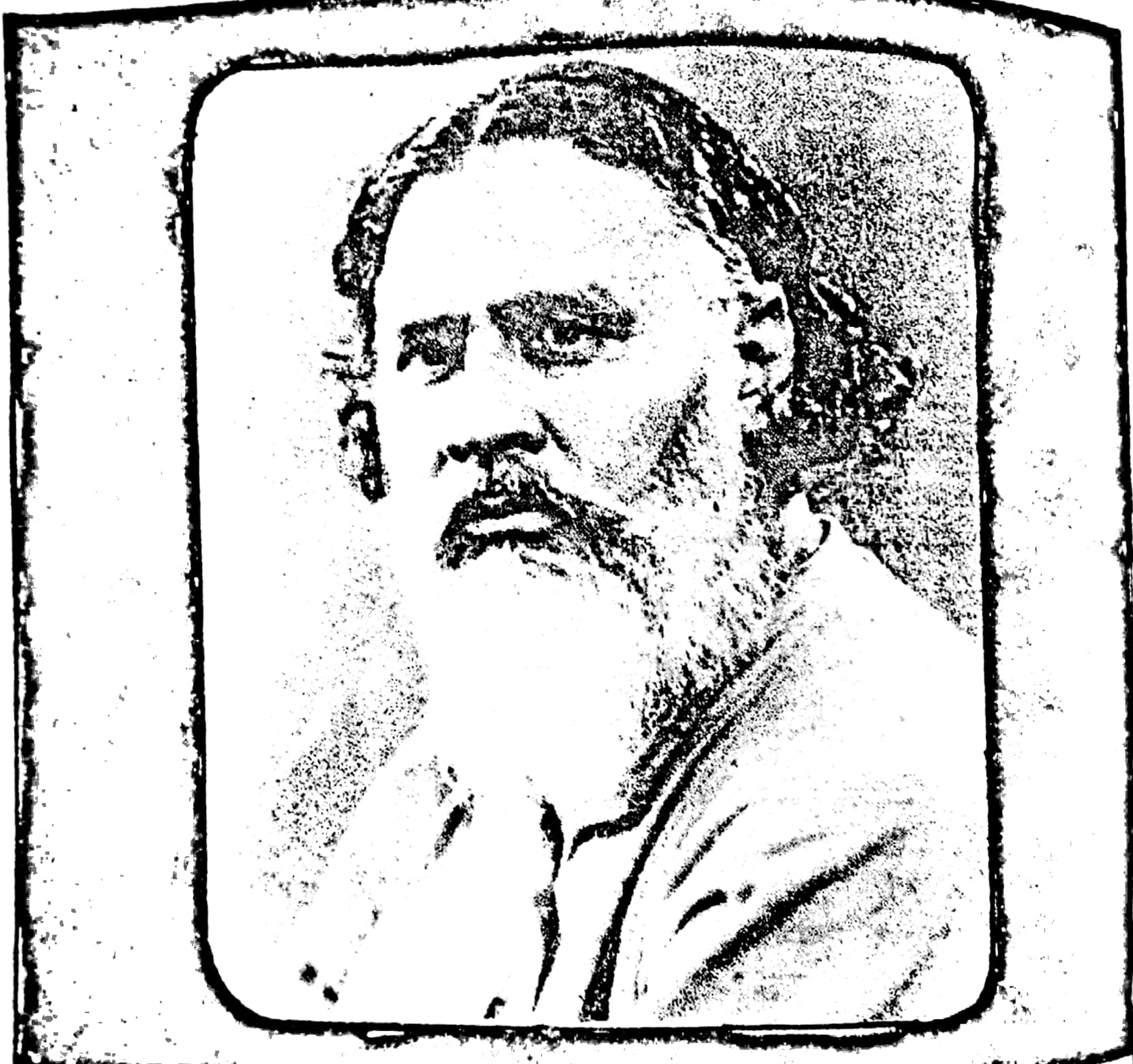
۱۱۔ اُپج: بناؤ سنگھار۔

۱۲۔ انفرادیت: جو مقرر کو صاحب طرز بناتی ہے۔

ان اجزاء کی مثالِ طبی نسخہ ایسی ہے۔ کہ ہر جز کا ایک وزن ہوتا ہے۔ اور شاہ جی کی خطابت میں ہر جز جھلکتا ہی نہیں بولتا ہے۔ اقتباس از سید عطاء اللہ شاہ بخاری (مصنف شورش کاشمیری مرحوم)

خطابِ امیر شریعتہ

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ



یہ تقریر ۲۲ مارچ ۱۹۴۴ء کو ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں کی گئی

تقریر پنجابی زبان میں تھی جسے محمد یوسف مطیع صاحب نے اردو میں منتقل کیا۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد ارشاد فرمایا۔

صدر محترم! اور میرے بزرگ بھائیو، بہنو اور بیٹیو!

میں اس مجلس کے اندر اس سے پہلے بھی کئی دفعہ حاضر ہوا، اور دو چار آیتیں سنائیں، آج بھی میں کوئی نیا پیغام، کوئی نیا پروگرام، کوئی اپنی کتاب، کوئی اپنا مضمون سنانے نہیں آیا۔ کوئی اپنا ایجاد کردہ مذہب نہیں، مسلک نہیں، سب کی مشترکہ کتاب ہے جس کا نام قرآن ہے جو بلا اختلاف ہے جس میں کوئی جھگڑا نہیں، جو یہ کہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے یا جو یہ کہے کہ قرآن میں یہ حصہ بندے کا ہے۔ اور یہ اللہ کا ہے۔ جب کی اُتری، جیسی اتری اور جتنی اتری اسی وقت کی ہے وہی ہے۔ اس کے حرفوں لفظوں اور حرکات و سکنات کو علیحدہ رکھو۔ جن اداؤں سے پیارے محمد مصطفیٰ ﷺ نے قرآن پڑھا، پڑھانے والے پڑھایا اور پڑھنے والے نے پڑھا، الحمدللہ وہ پاکیزہ ادائیں کالی کملی والے آقا کے غلاموں میں موجود ہیں، اس اُمت میں حافظ، عالم اور قاری سب موجود ہیں۔ حافظ اس کو کہتے ہیں جو یاد کرے، چاہے کسی طرح پڑھے عالم وہ ہے جو خود سمجھے اور دوسروں کو سمجھائے اور قاری وہ ہے جو قرأت سے پڑھے۔

قرأت کیا ہے جو حروف حضور ﷺ کی زبان مبارک سے جس جس اداء کے ساتھ نکلے، وہ بولنے کی اداء قرأت ہے۔

یاد رکھو وہ ادائیں ختم نہیں ہوئیں۔ مسلمانو! میری اپنی کوئی شے نہیں۔ یہ اللہ کی کتاب ہے جس کا ترجمہ کرتا ہوں۔ اگر میں غلطی کروں تو جاننے والے کا فرض ہے کہ وہ مجھے وہیں روک دے اور مجھے جہنم سے بچا لے۔ یہ غلطی یہ جرم قابل معافی نہیں ہے۔ میرے مضمون کا عنوان ہے۔

"قرآن کا مقصد کیا ہے اور قرآن بندوں سے کیا چاہتا ہے؟ یہ عقیدے کی بات ہے جو قرآن کو نہ مانے اس کو سمجھاؤ میں اس بحث میں کیوں پڑوں کہ فلاں مانتا ہے اور فلاں نہیں مانتا"

یہ کلام خدا کا ہے، اس نے اتارا محمد مصطفیٰ ﷺ پر اُترا جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ اسلام کی اصلی جائیداد اسلام کی شاندار اور بے مثال عمارت قرآن ہے بلکہ اسلام کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہے وہ قرآن ہے۔ یہ قرآن اسلام سے نکل جائے تو اسلام نری کھال ہے۔ یاد رکھو نبوت کا دل و دماغ اور توحید کی جان قرآن ہے۔ جب تک یہ نہ اترا تھا رسالت تھی نہ توحید۔ جب تک یہ نہ اترا تو محمد مصطفیٰ ﷺ محمد ابن عبداللہ تھے۔ اور جب یہ آیا تو محمد رسول اللہ ﷺ بن گئے۔ یہ نہ سمجھو کہ نزول قرآن سے پہلے نبوت اور توحید نہ تھی۔ وجود تھا مگر ظہور بعد میں ہوا۔ جو چیز اب موجود ہے اس میں کوئی مادہ اس کے ظہور سے پہلے دوڑ رہا تھا۔ گلاب کے پودے میں پھل پھول نکلا لیکن ان کا اثر پودے میں پہلے سے موجود تھا۔ وہ اثر خون

تم قرآن کو نہ مانو میں تو قرآن سنانے آیا ہوں

کی طرح اس میں دوڑ رہا تھا اور وہ ظاہر ہونے اور منظر عام پر آنے کے لئے بیتاب تھا، جب ظاہر ہوا تو اس کا اضطراب ختم ہو گیا۔ پھل پھول لوگوں کو معطر کرنے لگے اور فائدہ پہنچانے لگے۔ اب ہر کوئی پھول کی رنگت خوشبو اور فائدے پر مرتا ہے۔ پھول کا ظاہری اور باطنی حسن مقناطیسی قوتوں کے ساتھ ہر کالے گورے، اچھے اور برے کو اپنی طرف کھینچتا ہے وجود اور چیز ہے، ظہور اور چیز ہے۔ وجود ازل سے ہے ظہور سب سے بعد ہے پھول اب کھلا ہے مگر اثر اس کا پہلے سے موجود تھا۔

ہوتی ہیں۔ کبھی یہ سوچا کہ قرآن کے نزول کا مقصد کیا ہے جس کے لیے حضور اکرم ﷺ نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ ۲۳ برس بے چینی میں گزارے۔ جب قرآن آیا تب بھی مصیبتوں پر مصیبتیں اٹھائیں۔

میں نے قرآن سمجھانا اور سنانا شروع کیا تو ایک نقشبندی نے مجھ سے کہا ابھی تو اٹھ کر بیٹھا ہے اب بیٹھنا بھی نہ پڑے گا۔ پھانسی کا رسہ گلے میں پڑے گا۔ خدا خواہی بلا چاہی ہے۔ قرآن حق ہے باقی سب باطل ہے، قرآن پر چلنے ہی سے دنیا و آخرت کی خیر ہے باقی دوسرے راستوں پر چلو تو نہ دنیا کی خیر ہے نہ عقبیٰ کی یہ فرق ہے حق و باطل میں مسلمان بننے کے بعد تمہیں سوچنا پڑے گا کہ مسلمان دنیا میں کیوں آیا ہے اور باطل کیوں

میری بیٹھی ہوئی قبرو! تم کس دلدل میں پھنسی ہوئی ہو؟

موجود ہے۔ ہم پہلے کہاں تھے اور اب کہاں ہیں ہم کیوں سچے ہیں اور باطل کیوں جھوٹا ہے؟ کیا سچوں کا یہی حال ہوتا ہے ہوش کرو۔ اے میری جیتی جاگتی قبرو ہوش کرو۔ اپنے حالات کی طرف دیکھو، اپنے معاملات اپنی تجارت اپنے طور و اطوار اپنی عبادت، اپنے اعمال اپنے عقائد، اپنے مرنے جینے، اپنے حج نماز روزہ کا جائزہ لو۔ کیا سب کچھ اسلامی شریعت اور خدا و رسول کی عین مرضی کے مطابق ہے۔ دو چیزیں ہر بندہ کے لئے ہیں پہلی چیز خدا کی بندگی خالق کی پوجا ہے۔ دوسری چیز خدا کے بندوں سے سلوک ہے۔ مسلمانو اگر تم باز نہ آؤ گے تو یاد رکھو آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں آخر ایک نہ ایک دن مٹ جاؤ گے اگر مان لو گے تو بچ جاؤ گے۔ خدا نے فرمایا ہے مسلمانو! اگر تم نے میرے پیغمبروں کی بات نہ مانی، میری کتاب کو نہ مانا، میرے نبیوں کی نبوتوں کو تسلیم نہ کیا تو میں تمہاری جگہ اور قوم کو لا بساؤں گا۔ اگر تم ہم سے منہ پھیر لو گے تو ہم چہرے بدل دیں گے۔ تم نہیں تو اور سہی تم سے بہتر عمل کرنے والے اور ڈرنے والے ہمیں بہت مل جائیں گے۔ جو سپاہی پہرے پر کھڑا ہو اور وہ سو جائے تو اس کی وردی بوجہ غفلت و نافرمانی اتار لی جاتی ہے۔ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا جاتا ہے۔ افسر کہتے ہیں ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے ہمیں اور سپاہی بہت۔

میری بیٹھی ہوئی قبرو! تم کس دلدل میں پھنسی ہوئی ہو۔ قومیں منتظر ہیں۔ کفر تنگ آچکا ہے، کفر نے اپنا سازور لگا لیا ہے اس سے گانٹھ نہیں کھلی اور نہ کھلنی ہے۔ دیکھو یورپ کس عذاب میں پھنسا ہے، ابھی آج پہل ہوئی ہے، آج خدا سے واسطہ پڑا ہے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ یہ عذاب نہیں! یورپ کو خدا کی مار پڑ رہی ہے، یہ عذاب کیوں نازل ہوا۔ اس لیے کہ یورپ نے اپنی رائے اور اپنی تدبیر کو خدا کے حکم پر ترجیح دی، خدا کے حکم کو نہ مانا اور اپنی نفسانی خواہشوں پر چلے۔

میں وہ کتاب پیش کرتا ہوں جو پاک ہے۔ جو پاک خدا نے اتاری ہے، جو پاک نبی پر اتری ہے جو پاک فرشتے کے ذریعے اتری جو پاک زمین میں نازل ہوئی ہے جہاں عصمت ہی عصمت ہے۔ جہاں گناہ اور عیب کا نام تک نہیں، خدا رسول اور فرشتے سب عیبوں سے پاک ہیں۔

مسلمانو! بات کو سمجھو، اگر نہیں سمجھو گے تو ایک دن سمجھنا پڑے گا۔ یہ کتاب کا سلسلہ آج کا نہیں، ہم سے پہلے بھی بہت سے آدمی دنیا میں آئے۔ جب سے یہ کائنات خدا نے انسانوں اور جانوروں سے بسائی ہے،

جب سے آدم علیہ السلام دنیا میں آئے ہیں جب سے یہ دنیا آباد کی ہے یا اور کوئی دنیا آباد کی ہے مجھے اس سے بحث نہیں کہ کب سے یہ نظام تخلیق قائم ہے۔ قرآن کی شہادت ہے، خدا نے فرمایا ہے ہم نے سب کو پیدا کیا ہے، ٹھیک اندازہ کر کے راہ پر لگا دیا ہے بھینس بچہ جنے تو وہ بھینس کے پستان کی طرف دودھ کے لئے بھاگتا ہے بھینس کے منہ کی طرف نہیں بھاگتا۔ ہر جاندار پر یہ فطری قاعدہ ہے کہ وہ پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کے پستان کی طرف بھاگتا ہے۔ ماں کے منہ کی طرف کوئی نہیں جاتا۔ فرمایا یہ اس لیے کہ ہم نے ہر مخلوق کو اپنے اندازے کے مطابق بنایا ہے۔ ہم انسان اگر مخلوق بنانے پر ہوتے تو بھینس کی دم اونٹ کو لگا دیتے۔ بھینس کا منہ اونٹ کے جسم پر اور اونٹ کا منہ گائے کے جسم پر، نتیجہ یہ ہوتا ہر مخلوق کی نسل ختم ہو جاتی کیونکہ ہماری عقل ناقص ہے۔ خدا کہتا ہے ہم نے سب کو ناپ تول کر بنایا ہے۔ بدن کی رگیں بال سے باریک ہیں ان میں خون دوڑتا ہے۔ خدا

اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کے لئے نبیوں کو گنہگار نہ بناؤ

جانے خون کتنا پتلا ہے۔ کبھی رکتا نہیں، کیسی صفائی ہے۔ اتنی باریک رگوں میں خون کی جھلاری لگی ہے۔ جگر دل سے خون لیتا ہے جب دل بند ہو جاتا ہے تو قصہ ختم۔

اندر سارا ہی اسلام ہے اس سے سب متفق ہیں کہ دل جگر کا کام کرے یا جگر دل کا کام کرے جب اندر کے اسلام کو جو عین فطرت ہے سب مانتے ہیں تو خدا جانے یہ باہر کے اسلام کو کیوں نہیں مانتے خدا کے قانون کے آگے جھک جانے کا نام اسلام ہے۔ کان سننے کے لیے ہیں مگر ان سے سن نہیں سکتے۔ آنکھیں دیکھنے کے لیے ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے۔ اعضاء کو خدا نے جس جس کام پر لگا رکھا ہے ہر ایک وہی کام کر رہا ہے کوئی عضو خدا کی نافرمانی نہیں کرتا، کوئی طاقت اس فکری نظام کی مخالفت نہیں کرتی۔ عضو کو کوئی چیز برباد کرتی ہے تو وہ ہماری صحبت ہی برباد کرتی ہے۔

جب سے خدا نے یہ دنیا آباد کی، جب سے آدم علیہ السلام دنیا میں آئے۔ قانونِ کتاب دین آدم کے ساتھ آیا۔ خدا نے کتاب دے کر آدم سے فرمایا اے آدم اپنی اولاد کو اس طرح چلانا جس در پر قرآن اترا وہ آمنہ کا در ہے، کہ عرفات کا ٹیلا ہے، اس وقت سے لے کر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر دنیا میں آئے ہر پیغمبر اپنے ساتھ قانون اور کتاب لے کر آیا۔ کوئی پیغمبر بغیر کتاب نہ آیا۔ پیغمبر کے معنی ہیں پیغام لے کر آنے والا۔ یہ عصمت پیغمبر ہے۔ اٹھارہ پیغمبروں کے نام اس رکوع میں آئے ہیں، باقی پیغمبروں کے نام اور جگہ آئے ہیں۔ فرمایا اے محمد بعضوں کا حال بتاتا ہوں اور بعض پیغمبروں کا حال نہیں بتاتا، بات یوں ختم ہوئی۔ ان سارے پیغمبروں کو میں نے آپ قبول کیا آپ انکو راہ پر چلایا۔ (کیسا عمدہ ترجمہ شاہ عبد القادر صاحب نے صراط مستقیم کا کیا ہے کہ چلا ہم کو سیدھا رستہ) فرمایا خدا نے میں نے اپنے آپ چلایا انکو۔ گناہ ختم، خطاء ختم عیب ختم جسے اللہ آپ چلائے وہ گم کیسے ہو۔ یہ نبی کیسا ہے جسے آپ خدا چلائے سمجھائے اس سے گناہ ہو جائے توبہ توبہ! نبی سے گناہ ہو جائے خدا کی چادر اٹھ جائے، اگر میری نگاہ کسی عورت پر پڑ جائے تو تم کہو گے ایسے شاہ پر لعنت ہے۔ تم مجھے چوروں اور ڈاکوؤں کا سنگتی دیکھو۔ یا میں ڈاکوؤں کا مددگار بنوں اور پھر میں وعظ کرنے آؤں کیا پھر مجلس احرار رہتی ہے۔ کیا پھر مجھے دھکے دے کر نہ نکال دو گے نبی خدا

کا بھیجا ہوا پھر وہ گناہ کرے تو تم کہو گے کہ خدا نے یہ نبی بھیجا ہے۔ یہ کیسا نبی ہے!

اپنے نبیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے نبیوں کو گنہگار نہ بناؤ تم آپ عیب کرو۔۔۔۔ تم آپ جرم کرو، اور ذمے ان کے لگاؤ، کچھ ہوش کرو، کیا کہہ رہے ہو، خدا کہتا ہے میں نے آپ اپنے نبیوں کو قبول کیا۔

نبی کو تین نعمتیں دیں ایک کتاب، دوسرے فیصلہ اور تیسرے جھگڑوں اور فتنہ بازیوں کو چکا دینے والا۔

مسلمانو! خدا نے فرمایا! نبیوں کو اس لیے بھیجا کہ میری خبریں اپنے نبیوں کی راہ اپنے بندوں تک پہنچاؤں اور نبی بندوں کی باتیں اپنے ذریعے مجھ تک پہنچائیں۔ ڈاکوؤں اور شیطان سے اس کو محفوظ رکھا۔ حفاظت کے لیے دیانت دار فرشتے اس پر مقرر کیے ڈاکوؤں کو دفع کر دیا۔ یہ ہیں وہ نبی جنھیں منزل پر میں نے آپ پہنچایا۔ اے محمد ان کی راہ پر تم بھی لگو۔ دنیا سے کہہ دو میں تمہارا مزدور نہیں ہوں۔ اس کا بدلہ اس کی مزدوری تم سے لینے نہیں آیا، لیکن سارے جہان کے لئے ہدایت اور رحمت لے کر آیا ہوں۔ خدا نے فرمایا ہم نے آپ اتاری تو رات اس میں نور اور روشنی ہے مسلمان اس لیے پیدا ہوئے کہ قرآن پڑھیں۔ یہ میری کتاب پڑھنی پڑے گی۔

مسلمانو! میری درد بھری پکار کو سنو، مُلّا اور مولوی صاحب، سب بھولے ہوئے ہیں۔ اے مولویو، اے ملاؤ تم ساری عمر میں بیضاوی کتاب پوری نہ پڑھ سکے۔ ساری عمر فلسفے کے حصول میں گزاری۔ اس کے لیے تم نے دیو بند مدرسہ اور دوسرے مدرسے بنائے جنھیں دینی مدرسے کہتے ہیں۔ یہ کیا حال ہے تمہارے دین کا۔ تم نے قرآن کو ردی کر کے پھینک دیا۔ افسوس ہم غفلت میں پڑ گئے۔

توبہ توبہ اگر محمد مصطفیٰ ﷺ آج مزار سے باہر آ جائیں اور وہ یہ حال دیکھیں تو پکار اٹھیں میرے خدا میری قوم نے قرآن کو ردی کر کے پھینک دیا۔

مسلمانو جس طرف تم لگے ہو اس سے کچھ نہیں بننا۔ جن راستوں پر تم چل رہے ہو یہ راستے تمہیں کعبہ نہیں پہنچاتے۔ نہ تم ان راستوں سے کعبہ پہنچتے ہو۔ اسلام چاہتے ہو تو قرآن کے دروازے سے آؤ، اگر رضائے الٰہی چاہتے ہو تو محمد مصطفیٰ کی پیروی کرو۔ پیچھے لگ پڑو اس شے کے جو اتاری تم پر تمہارے رب نے۔ فرمایا۔ (اس کتاب کے علاوہ) کسی کتاب پر نہ چلو کسی کی خواہش پر نہ چلو۔ ہائے افسوس! قرآن کو تم نے نہ سمجھا۔ تعویذ حُب کا کروانا ہو تو قرآن کھولو، فال نکلوانی ہو تو کہتے ہو قرآن

سات سو سال مسلمانوں کی بادشاہت رہی لیکن ایک دن بھی قرآنی قانون پر عمل نہ ہوا۔

کھولو، اغوا کرنا ہو تو قرآن کھولو، پلید چارپائی (بستر مرگ) کے گرد سورہ یٰسین پڑھنی ہو تو کہتے ہو قرآن کھولو۔ مردے کی فاتحہ کے لیے کہتے ہو قرآن کھولو، کیا قرآن کا استعمال یہی ہے۔ یاد رکھو قرآن سلطان کی کتاب ہے۔ بادشاہ کا قانون ہے۔ انگریز بہادر کا سرکاری جج مرے تو اس کے گرد قرآن پڑھو گے۔ جس پھول کو دیکھنے سے دل راضی ہوتا ہے خدا کے لیے اسے سونگھو تو سہی جس شراب کے دیکھنے سے مستی آتی ہے خدارا اسے پی کے تو دیکھو کیسا لطف آتا ہے۔ جو قرآن بزرگوں کی قبروں پر تم کو بخشوا دے کیا وہ مُردوں کو زندہ نہیں کر سکتا۔ جہاں تم قرآن کو برتتے ہو جہاں تم قرآن کو استعمال کرتے ہو یہ ادنیٰ درجے کا کمال ہے، اس کا مقام اور ہے، یہ مردہ

قوموں کو زندہ کرنے آیا ہے۔ اس سے بیماریاں اور امراض دور ہوتے ہیں۔ تم اپنی بخشش کے لئے اسے پڑھتے ہو۔ اگر ساری قوم کے لیے پڑھو تو مردہ قوم زندہ ہو جائے۔ فرمایا خدا نے ان سب کے پیچھے چلایا ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو راہ سیدھی جو سچ بتاتا ہے سب کتابوں کو انجیل کو توریت کو اور زبور کو اور پیغمبروں کے صحیفوں کو جن میں راہ اور روشنی ہے اور جو بچ کر مجھ تک آنا چاہیں ان لے لیے راہ سیدھی ہے اس سے جھگڑے چکائیں، اس سے فیصلے کریں۔

او چشتیو! اجمیر شریف کی طرف دیکھو، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری پر نظر کرو۔ او نقشبندیو سرہند شریف کی طرف دیکھو۔ حضرت مجدد الف ثانی پر نظر کرو۔ اگر حضرت مجدد شہنشاہ جہانگیر سے مقابلہ نہ کرتے تو ولایت نہ رہتی۔ حضرت مجدد صاحب کان ہیں دین کی، پہاڑ ہیں سونے کا، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی دونوں اسلام کا تاج ہیں۔

او آمین بالجہر اور رفع یدین پر جھگڑنے والو۔ اور یا رسول اللہ ﷺ کہنے والو، میں یارسول اللہ کہنے کا حامی ہوں مگر تم بے وقت اور بے معنی یارسول اللہ کہتے ہو۔ یارسول اللہ کے آگے پیچھے تو کچھ کہو۔ درود پڑھو۔ خالی یارسول اللہ کہنا تو خدا کو نہیں بھاتا۔

قرآن کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے آپ اتاری تمہاری طرف کتاب فرمایا خدا نے اے محمد اب میں تمہاری طرف اتارتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں میں آپ اتارتا ہوں۔۔۔ کا ہے کے لیے اس لیے تاکہ تم اس سے لوگوں کے (صرف مومنوں ہی کے نہیں) جھگڑے چکاؤ اور بندوں کے مقدمے کا فیصلہ کرو اب کسی کی اپنی رائے نہیں۔ اے محمد ﷺ جیسے جیسے میں بتاتا جاؤں تم ان کے جھگڑے چکاتے جاؤ۔ جو میری نہیں مانتے میرے غدار ہیں انکی سفارش نہ کرو۔ تمہاری تو عادت ہی ہے سفارش کرنی کیونکہ تم سراپا رحمت ہو۔

سات سو سال مسلمانوں کی بادشاہت رہی لیکن ایک دن بھی قرآنی قانون پر عمل نہ ہوا۔

یاد رکھو غلبہ کفر کا ہو، حکومت کفر کی ہو تو نسبت بھی کفر کی ہوتی ہے غلبہ اسلام کا ہو، حکومت اسلام کی ہو تو نسبت اسلام کی ہوتی ہے۔ چند اللہ کے بندوں نے ہندوستان میں قرآن کو سمجھا حضرت مجدد الف ثانی نے قرآن کو سمجھا۔ میں تو جاہل ہوں کچھ نہیں سمجھتا میں کبھی مجدد الف ثانی کے در سے قرآن کی خیرات لیتا ہوں اور کبھی شاہ ولی اللہ محدث کے در سے، میرا اپنا کچھ نہیں جس کا ملک ہوتا ہے قانون بھی اسی کا چلتا ہے۔ ملک خدا کا ہے قانون بھی خدا ہی کا چلنا چاہیے۔ خبردار ہو جاؤ بندو خلق اس کی رعایا اس کی ملک اس کا امر بھی اسی کا ہے۔ روس زندہ نہیں رہ سکتا اگر روس میں جرمنی کا قانون آجائے۔

او میری ہلتی جلتی قبرو! ایمان دب گیا۔ تم بیٹھی قبریں ہو اور میں کھڑی قبر ہوں۔ میں مر جاتا اور تم بدل جاتے یا تم مر جائے اور میں بدل جاتا تم اس حالت میں ہوتے یا میں اس حالت میں نہ ہوتا۔ میں قرآن سمجھاؤں اور سناؤں پھر میری اور تمہاری یہ حالت ہو یہ سراسر جہالت ہے قرآن سنو اور نہ بدلو۔

اے مسلمانو! تم کس دلدل میں پھنسے ہو۔ فرمایا خدا نے میں نے اپنے لاڈلے (پیارے موسیٰ) کو فرعون اور اس کی نسل کی طرف کتاب نشانیاں اور غلبہ دے کر بھیجا۔ مگر وہ (لوگ) قانون فرعون کے پیچھے لگ گئے۔ حالانکہ فرعون کا حکم کسی کام کا نہ تھا۔ قیامت کے روز فرعون آگے آگے چلے گا اور پیچھے پیچھے اس کی قوم ہو گی۔ اس طرح فرعون خود کو اور اپنی قوم کو جہنم میں لے کر جا اُتارے گا۔ کیسے بُرے گھاٹ اُتارا فرعون نے ان کو۔ فرعون کی طرف ہو کر انہوں نے موسیٰ کی نہ مانی، مانی تو فرعون کی مانی۔ فرعون کا قانون کسی کام نہ تھا۔ وہ چلے گا

اپنی قوم کے آگے آگے اور لے جا اتارے گا جہنم میں۔ برے گھاٹ اور برے حال ---- یہ پیغمبروں کا حال ہے جو میں نے تمہیں سنایا ہے۔

اب اُمتوں کا حال سنو: خدا نے فرمایا اے عاد کی قوم دیکھو تم نے اللہ کی نشانیوں سے انکار کیا۔ تم نے خدا کا قانون نہ مانا رسولوں کی تم نے نہ مانی۔ مانی تو اس کی مانی جو تمہارے پاس ڈنڈا لے کر آیا جو (زور والا اور میرا باغی) آیا تم اس کی ماننے لگے۔ یہ وہ قوم عاد ہے کہ اس کے پیچھے اس دنیا میں بھی پھٹکار لگا دی اور حشر کے روز بھی پھٹکار ہو گی۔ اے عاد کی قوم دیکھو تم نے میرے حکم کا انکار کیا جن کو میں نے بھیجا تم نے انکی نہ مانی ان کی نافرمانی کی۔ جو میرے دروازہ سے منہ موڑ کر، ڈنڈا لے کر آیا تم اُس کی ماننے لگے۔

ولایتیو اور نُبوتوں کے مُدعیو! اے دعویدارو تمہیں ابھی تک لعنت کا پتہ نہیں چلا؟ حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر مراقبہ کرو۔ جس کے اور مدینہ کے درمیا کوئی روک نہیں۔ سرہند شریف سے روضۂ نبوی تک ایک نور کی دیوار ہے جس میں کوئی چیز حائل نہیں سیدھی ڈاک آتی جاتی ہے۔ حضرت مجدد صاحب مدینہ والے آقا ﷺ سے پوچھ کر بات کرتے ہیں۔ ہر حکم مدینہ سے صادر ہوتا ہے۔ مجھے مکتوبات مجدد سے کچھ اور نظر آتا ہے۔ (تمہیں کچھ اور نظر آتا ہے) صرف دیکھنے اور سمجھنے کا فرق ہے۔ یہاں تم ولدستوں پر بیٹھے ہو۔ یہ تو اس اُمت یعنی قوم عاد کا حال ہو گیا۔ اب تمہیں کیا حکم ہے۔ فرمایا خدا نے اے محمد ﷺ! بڑی شان دار کتاب ہم نے تم پر اتاری ہے۔ اس قرآن سے ڈراتے وقت دل میں ذرا تنگی نہ آئے۔ نصیحت ماننے والوں کے لیے نصیحت ہے۔ اتری نبی کریم ﷺ پر۔ فرمایا اے بندو تم میری اس کتاب کے پیچھے لگ جاؤ جو تمہارے رب نے اتاری ہے، کبھی رفیق سنگی کے پیچھے نہ لگو۔ تم دھیان ہی نہیں کرتے اگر تھوڑا سا دھیان بھی کرو تو کام بن جائے۔

اُس وقت تو مستی سے کیا حال ہوا ہو گا\
جب تو نے یہ مے ساقی شیشے میں بھری ہو گی

تم کیا خطبے سنتے ہو کام تو ختم ہو گیا میں نے کسی کی بات سنائی اپنی نہیں سنائی۔ فرمایا خدا نے میری فوری مار (عذاب) کے آنے سے پہلے پہلے اس اچھی بات کے پیچھے لگ جاؤ۔ جو اتاری میں نے تمہاری طرف اس گھڑی سے پہلے پہلے کہ اچانک میری مار تم پر آ پڑے پھر تم کو پتہ بھی نہ لگے۔ اے میرے نبیو میرے فرشتو میری کتابوں، جنت دوزخ، حشر نشر کے ماننے والو کہنا مانو خدا کا اس کے بھیجے ہوئے رسول ﷺ کا اور اس کا جو تم میں سے خود اللہ اور اس کے رسول کا کہنا منوائے اولی الامر کا ترجمہ تو وہ ہے جو کہا ہے۔ مگر پنجاب کا ترجمہ یہ ہے (اللہ و رسول کا کہنا مانو اور) اس کا کہنا مانو جو (ڈنڈے والا) تم پر چڑھ دوڑے جو زور والا آئے اس کی مانو۔

مسلمانو ہوش کرو، گناہ کرنے کو اور بہت سی جگہیں ہیں۔ منہ کالا کرنا ہے تو کسی اور جگہ کرو یہاں تو نہ کرو۔ خدا تو کہہ رہا ہے میری مانو میرے رسول کی مانو اور جو میرے حکموں کو سنبھال کر بیٹھے اس کی مانو۔ میری قبرو تم نے کفر کو اولی الامر مان لیا۔ ہائے ہائے تم کس دلدل میں پھنس گئے۔ خدا کچھ کہے اور تم کچھ کہو۔ ---- وہ کہو جو خدا کہتا ہے۔ یہ میں نے وعظ نہیں کیا، قرآن کا درس دیا ہے۔

اے تاجدار مدینہ ﷺ تم پر ہزاروں درود و سلام ہو۔ ہم گنہگاروں کا ان گنت سلام ہو۔ جہنم سے پکڑ کر ہمیں نکالنے والے تم پر کروڑوں سلام ہوں۔ مسلمانو تمہیں یہ بات پسند آ گئی۔ مسلمانوں نے کہا ہاں پسند آ گئی۔ مسلمانو میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ صرف خدا کا کلام سنایا ہے۔ یا اللہ قرآن کو ہمارے لیے دلیل بنا۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔



امیر شریعت کے حضور



منظوم خراجِ عقیدت

بیباک مجاہد

نذیر احمد خواجہ
لیکچرار اسلامیہ کالج ریلوے روڈ۔ لاہور

تھی فضا خاموش حرکت میں نہ تھی بادِ صبا لطمۂ امواج سے خالی تھا دامن بحر کا
ظلمتوں کے جال میں انجم تھے سب رشتہ بہ پا ایک سناٹے کا عالم گلشنِ ملت پہ تھا
تھے خزاں کی گرد سے سب، پھول کملائے ہوئے
باغبانوں کے بھی دل تھے سخت مُرجھائے ہوئے

اس طرح اغیار نے لوٹی بہار زندگی نہ یقینِ مرگ تھا نہ اعتبارِ زندگی
کوئی باقی ہی نہ تھی وجہ قرارِ زندگی بُجھ چلا تھا قلبِ ملت سے شرار زندگی
ظلمت باطل نے یوں مستور نورِ حق کیا
زمزموں سے عشق کے خاموش طورِ حق کیا

ایک ہنگاموں کی دُنیا اپنے دامن میں لئے آگیا ایسے میں کوئی تیغِ حق عریاں کیے
اسکی پھونکوں سے چمک اُٹھتے تھے ایماں کے دئیے سوزنِ تدبیر سے سب چاکِ دل اس نے سیئے
اس مجاہد کا عطاء اللہ بخاری نام تھا
راستی پر ڈٹ کے جاں دینا یہ اس کا کام تھا

اے کمالِ عظمت ملت کے تابندہ نشاں اے شریعت کے علمبردار اے غازی جواں
تُو تو نہ تھا ایک بلبلِ رنگیں نوا شیریں بیاں شعلۂ آواز میں تیرے نہاں تھیں بجلیاں
تو مثال ابر غرّاں چھا گیا افلاک پر
اور برسا صورتِ شبنم وطن کی خاک پر

اے غلام مالکِ ہر دو جہاں صاحب یقیں ظلم کے آگے ترا سر خم ہوا؟ ہر گز نہیں
یہ کبھی ممکن نہ تھا اے قافلہ سالارِ دیں توڑ دے زنجیر آہن تیرا عزم آہنیں
جذبۂ آزادئ تو قیدِ زنداں کم نہ کرو
ذوقِ سیرِ راہِ حق خارِ مغیلاں کم نہ کرو

(حفیظ تائب)

نقیبِ عظمتِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

منفرد ذوقِ عمل، زورِ بیاں رکھتا تھا
دلِ پُر سوز، لبِ شعلہ فشاں رکھتا تھا

لب پہ توحید کے نغمات رواں رہتے تھے
دل میں عشقِ شہ لولاک نہاں رکھتا تھا

کوئی خواہش نہیں رکھتا تھا بجز خدمتِ دیں
اس تمنا کو بہرحال جواں رکھتا تھا

اُٹھ گیا عظمت و تقدیسِ رسالت کا نقیب
سینۂ شوق میں جو برقِ تپاں رکھتا تھا

روشِ اہلِ جہاں کا وہ نہیں تھا پابند
مردِ آزاد الگ اپنا جہاں رکھتا تھا

اس کے پاؤں میں نہ آئی کبھی لغزش تائب
راہ میں گرچہ کئی سنگِ گراں رکھتا تھا

مردِ حق آگاہ

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

(پروفیسر اصغر سودائی ایم اے)

تھا زندہ و پائندہ و تابندہ و بیدار
وہ مردِ جری، شیر خدا، صاحبِ اسرار
تخلیق کے ماتھے کا چمکتا ہوا غازہ
تعمیر کے چہرے کا دمکتا ہوا سنگار
آئینۂ اخلاص و وفا جس کی نگاہیں
جو وقت پہ تھیں خار اشگافی کو بھی تیار
ہونٹوں کی نوا درسِ ابراہیم کا اعلان
ہاتھوں کا عصا ضربِ کلیمی کا نشاں دار
بُت خانۂ افرنگ میں اک مردِ حق آگاہ
تھا عظمتِ کعبہ کا نگہبان و نگہدار
اسلام کی صف ہو تو ہر اک درد کا درماں
کفار کا لشکر ہو تو بپھری ہوئی تلوار
وہ شاہ تھا ہاں شاہ قلمروئے بیاں کا
فن اُس کی خطابت کا کمالِ لبِ اظہار
تقریر کے ہنگام امڈتا ہوا دریا
تحریر کے دوران صد قلزمِ ذخار
وہ حُسنِ بیاں، حُسنِ ادا، حُسنِ تلفظ
جذبات کی تلخی میں بھی شیرینیٔ گفتار
قرآں کی تلاوت میں پیامِ سحر انگیز
سُن لیں تو فرشتوں کی بھی تقدیر ہو بیدار
تفسیر کا موقع ہو تو اللہُ غنی، عِلم!
گرتی ہی چلی جائے ہر اک کفر کی دیوار

پُر مغز تھا، پُر شوق تھا، پُر شوق بخاری
وابستۂ توحید تھا، دانندۂ اسرار

مولانا انور صابری (مرحوم)

امیر شریعت

خطیبِ اعظم اسلام فخرِ بزمِ ایمانی
دلوں کا ذکر کیا روحوں کو گرماتی رہی برسوں
چراغِ محفلِ ختمِ رسالت بن کر چمکی ہے
جہاد حرّیت میں رہبرانہ شان کے صدقے
محمد ﷺ کی غلامی تیرا تاجِ زندگانی تھی
وقارِ بوذری تھا تیری درویشی کی رگ رگ میں
ترے خود دار جذبوں کا مزاج عزم ہستی تھا
مری مجبوریوں کو دیکھ اے آزاد خو انساں
نئی حد بندیاں ہیں اور میری چشمِ گریاں ہے

جمالستانِ عرفاں تھی تیری پُرنور پیشانی
فضاؤں میں ترے الفاظ کے چہروں کی تابانی
تری آنکھوں کے حجروں میں ضیائے شمع ربانی
کرے گی ناز تجھ پر حشر تک تاریخِ انسانی
ہمیشہ تو نے ٹھکرایا غرورِ تاجِ سُلطانی
فقیرانہ اداء تھی ہم مزاجِ فقرِ سلمانی
مکمل خاکۂ تکمیلِ دستورِ جہانبانی
لحد پر آ نہیں سکتا برائے فاتحہ خوانی
ہے درس آموزِ دُنیا میرے اشکوں کی پریشانی

بہاروں میں بھی میرے دل کا غنچہ کِھل نہیں سکتا
تری راہوں پہ چل سکتا ہوں لیکن مل نہیں سکتا

جناب پروفیسر احسن زیدی مرحوم فیصل آباد

نگارِ ہستی سنوارتا تھا

وہ شاہِ اقلیمِ فنِ اظہار سب کو آوازدے رہا تھا
مذاق پروازدے رہا تھا
وہ آشنائے مزاجِ عالم، مئے تگ وتازدے رہا تھا
مزاجِ شہبازدے رہا تھا
مخالفت کے بپھرتے طوفاں میں اپنی دھن میں رواں دواں تھا
گئے زمانوں کا نغمہ خواں تھا
لبادۂ قادیانیت کے لئے وہ اک شعلۂ تپاں تھا
وہ مذہبِ حق کا پاسباں تھا
وہ اپنے الحان کے فسوں سے دلوں میں قرآں اُتارتا تھا
سماعتوں کو پکارتا تھا
وہ فیض یابِ درِ رسالت، شرافتوں کو اُبھارتا تھا
نگارِ ہستی سنوارتا تھا



(بسمل سعیدی دہلی)

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری

باطل پسند ہونا بڑا سُود مند تھا
وہ مردِ با خدا تو مگر حق پسند تھا

بے لوث و بے ہراس گزاری تمام عُمر
تھی حرصِ عزّ و جاہ نہ خوفِ گزند تھا

اٹھی نہ سوئے دولتِ دنیا کبھی نظر
کس درجہ بے نیاز دلِ مستمند تھا

چلتا فریب دانہ و دام اس پہ کس طرح
سدرہ نشیں بلند زکید و کمند تھا

تھا دردِ مُلک و مِلّت اُسے جان سے عزیز
درماں سے بے نیاز دلِ درد مند تھا

گرمی سے حُریّت کی اک آتشکدہ تھا دل
اور دل میں جو خیال تھا گویا سپند تھا

اس ساحرِ کلام کے ایک ایک لفظ میں
اک قلزمِ معانیٔ و مفہوم بند تھا

دارو رسن کے پنجۂ خونیں سے بے نیاز
محبوب اس کو سلسلۂ قید و بند تھا

ہم اور اس کی موت کے شایانِ شان غم
اس کا مقام و مرتبہ بسمل بلند تھا

تجمل حسین دل

بیاد بخاری

پھر مرے نغمۂ جذبات کی لے ٹوٹ گئی
ساز روتے ہیں غزل زار میں ویرانی ہے

خاک سی اڑتی ہے اب وقت کے ویرانوں میں
عقل کے کوچہ و بازار میں ویرانی ہے

عشق پھر دست بہ دل خاک بہ سر بیٹھا ہے
آج پھر حسن کے دربار میں ویرانی ہے

جن کے لہجے میں خیالوں کی کھنک ہوتی تھی
ان کے پیرائیہ اظہار میں ویرانی ہے

چند لمحوں کے لئے فصل وفا مہکی تھی
آج ہر گوشۂ گلزار میں ویرانی ہے

اس نے پھولوں پہ رگ جاں کا لہو چھڑکا تھا
تو نے وہ رنگ بھی اے دست صبا چھین لیا

کس نے پیراہنِ لیلائے چمن چاک کیا
کس نے کلیوں سے وہ اندازِ حیا چھین لیا

رہنماؤں نے دیا ہم کو وہ دستورِ حیات
جس نے مفہومِ رہ و رسم وفا چھین لیا

ہر نئے دور میں وہ ظل الٰہی ٹھہرا
جس نے جمہور کی محنت کا صلا چھین لیا

میں نے جب بھی ترے نغمات کی دھن چھیڑی ہے
میرِ محفل نے مرا سازِ نوا چھین لیا



امیر شریعت

حافظ امرتسری مرحوم

خطابت تھی تجھ کو خدا سے ودیعت
وہ میداں کا غازی وہ مردِ قلندر
مصائب کا خوگر، مجسم صداقت
وہ عابد،و زاہد، وہ بندہ خدا کا
بلی جس کے ہاتھوں میں شعلہ نوائی
خلوص و مروّت رہا جس کا زیور
وہ شاعر، مبلّغ، مبصّر، مقرّر
فصاحت، بلاغت کا سیلِ رواں تھا
سیاست، فراست میں تھا وہ یگانہ
وہ حق گو وہ بیباک، ساحر بخاری

ہوا ہم سے رخصت وہ امیرِ شریعتؒ
شجاعت کا پُتلا شرافت کا پیکر
مجاہد، نڈر، پارسا، پاک طینت
جواں فکر، معجز بیاں تھا بلا کا
ہوئی جس کی گرویدہ ساری خدائی
عطاء تھے جسے خسرویّت کے تیور
شریعت کا پیرو طریقت کا رہبر
وہ الفاظ و معنی کا بحرِ جواں تھا
رہا جس کا زنداں میں برسوں ٹھکانہ
گلستانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بادِ بہاری

خطابت تھی جس کو خدا سے ودیعت
ہوا ہم سے رخصت وہ امیر شریعتؒ



مرثیہ

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

اشک ملتانی

اے وہ کہ ترے فقر میں تھی بوئے ابو ذر
اے وہ کہ ترے صدق میں سلماںؓ کی شباہت

صدیق سے ملتی تھیں تری فکر کی راہیں
تم دونوں کا ایمان رہا ختم نبوت

صورت میں تری ہیبتِ فاروق کا پر تو
ہونٹوں پہ تھی نازل تیرے حیدر کی خطابت

ہر چند کہ ہر سمت سے تھی یورش باطل
ہاتھوں سے دیا تو نے نہ دامانِ صداقت

ہر چند کے ہر گام پہ تھا شور سلاسل
آئی نہ ترے عزم میں اک لحظہ نقاہت

منبر پہ نہ اس نشان سے گونجے گی تلاوت
میداں میں نہ اس شان سے نکلے گی قیادت

بلبل تو بہت اور بھی چہکیں گے چمن میں
باتوں میں نہ آئے گی مگر تجھ سی حلاوت

کلیاں تو بہت اور بھی مہکیں گی، مگر اب
پھولوں پہ نہ آئے گی وہ پہلی سی طراوت

ہر سانس ترا عشق کا مہکا ہوا غنچہ
ہر بات تری حُسن کی نکھری ہوئی صورت

برسوں تجھے روئیں گی یہ مغموم مساجد
آنکھوں کو رُلاتی تھی جہاں تیری تلاوت

صدیوں تجھے ترسیں گی یہ ویران مجالس
تڑپاتی تھی روحوں کو جہاں تیری خطابت

اے کہ وہ ترے سوز سے تھی گرمیٔ محفل
اے وہ کہ ترے لحن سے بلبل کو ندامت

اے رونقِ محراب وہ محراب ہیں گریاں
دیتی تھی جہاں زیب فقط تیری امامت

اے قاریٔ قرآن ترے بعد جہاں میں
ہر سمت تجھے ڈھونڈتی پھرتی ہے تلاوت

اے مدحِ رسالت میں چہکتے ہوئے بلبل
کچھ اور چہک، گوش میں محروم حلاوت

اے چشمۂ کوثر کے بہکتے ہوئے میکش
کچھ اور بہک، مست ہیں رندانِ طریقت

اے باغِ سعادت کے مہکتے ہوئے نسریں
کچھ اور مہک پھیلی ہے ہر سمت عفونت

اے مزرعِ فطرت کے لہکتے ہوئے سنبل
کچھ اور لہک رقص میں ہے **مزرعِ فطرت**

سوچا کہ لحد میں ہے کسے تیری رفاقت؟
افلاک سے معاً یہ ندا آئی کہ "رحمت"

افسوس کہ وہ نعرۂ بیباک ہے خاموش
تھی جس کی صدا کفر کو ناقوسِ ہلاکت

"جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! کوئی اور بھی ہے روزِ قیامت

مجموعۂ خوبی تھی تیری ذات گرامی
تو آپ ہی تھا اپنی بزرگی کی شہادت

خامے کو کہاں یارائے توفیق کہ لکھے
القصہ تری ذات تھی اللہ کی آیت

فیروز سائیں (پنجابی)

سردار سید

بڑا ھرج پہنچا وندی قوم تائیں
دل لکھاں سپاہیاں دا توڑ دیوے
جدوں موت آئے سچے رہبراں نوں
یادر ہے سانوں کدی بھلنی نہیں

درد مند عالم غم خوار دی موت
ہو جائے جد سپہ سالار دی موت
تدوں ہوندی اے لکھ ہزار دی موت
یارو سید بخاری سردار دی موت

O

جیہڑے قوم توں جان قربان کر دے
اج موت نے آن کے چھڈیا نہ
سچی گل سنائے نڈر ہو کے
دِلوں بُرا غلامی نوں جاندا سی!

گھٹ ہو وندے اُہ سردار سید
ہے سی مدتاں دا بیمار سید
گیا جیل اندر کئی وار سید
ٹُر گیا اوہ اج احرار سید

O

لکھ رحمتاں تیرے نصیب ہوون
بخش دیوے گا رب کریم تینوں
پتھر دلاں نوں موم بناوندا سی
قرآن دے نال سی پیار تینوں

ہووے جنت دے وچ مکان تیرا
ہے سی بڑا مضبوط ایمان تیرا
سچا خلق تے سوہنا بیان تیرا
بھلا کرے گا رب رحمان تیرا

O

امیرِ شریعت دی بارگاہ وچ ہنجواں دا نذرانہ

میر محمد دین میر ۔ مرحوم

ہنجو کرن تے کرن پے حشر توڑیں کون ایناں تائیں سنبھال سکدا اے
تیرے بنا اندھیر ہو گیا شاہ جی کون جادو دے دیوے بال سکدا اے
جنہوں کہن زبان زبان تیری ساڈی قسمت اوہ بند زبان ہو گئی
باغ ختم نبوت وچ کھڑی سی جو ہائے کلی اوہ آج ویران ہو گئی
طائر اوڈ دے سن کھلو جاندے جد توں وجد وچ سیں قرآن پڑھدا
سب نوں ایہو مغالطہ سی ہوندا ایہہ جبریل پڑھدا انساں پڑھدا
توں سیں تارو سیاسی سمندراں دا کشتی ڈولدی دا نا خدا سیں توں
راہنما جگدے جنّے ہیں آجکل دسدا اونہاں نوں راہ ہدیٰ سیں توں
بڑے بڑے متکبراں ظالماں دے منہ تے حق دی گل توں کہن والا
سر توں پیراں تک پا کے زنجیر شاہ جی نال خنداں پیشانی دے رہن والا
کون دسے گا پاک کلام پڑھ کے کون ظالم دے منہ تے سچ کہہ سی
کون ختم نبوت دے جلساں وچ ہیر ہیرا کہہ سی کنج کنج کہہ سی
سانوں جگ وچ چھڈ کے یا مولا عطاء اللہ نوں توں پسند کیتا
پہلے ختم نبوت دا سی کیتا ہن خطابت دا بھی بوا بند کیتا
میرؔ حق وصداقت دے بول سچے حشر تک نہ امّت نوں بھلنے نے
موتی نکلے جو صدف زبان وچوں اگے در یتیم دے تکنے نے

اختر و اصفی

وفات
۱۳۸۱ھ
۹ ربیع الاول - ۲۱ اگست -
بروز پیر - بعد از عصر
۱۹۶۱ء

قطعہ

عطاء اللہ شہ سوئے جنت سدھارے
خبر آئی جس وقت از شہر ملتان
گھٹا چھا گئی مطلع دل پر غم کی
ہوا مضطرب سن کے ہر ایک مسلمان
جو ہاتف سے تاریخ پوچھی تو بولا
نہ ہو اختر و اصفی تو پریشان
بتاتا ہوں تاریخ ہجری تجھے میں
امیر شریعت گیا پاک داماں "
۱۳۸۱ھ

وہ سید کہ تھا صدر احرار ملت
جسے لوگ کہتے تھے شاہِ خطابت
یہ دنیا کہ مومن کا ہے قید خانہ
اسے چھوڑ کر وہ گیا سوئے جنت
ہوئی جستجو اختر و اصفی کو
چو از بہر ارقام تاریخ رحلت
ندا آئی کیوں ہو نہ تاریک عالم
گیا مہر تاباں امیر شریعت ......"
۱۹۶۱ء



رفتید و لے نہ از دل ما

واپسی

شاہ جی کا یہ عکس استاد اللہ بخش مرحوم کے موئے قلم سے ہے

FORTNIGHTLY "AL - AHRAR" LAHORE Regd No - L 7818